مئی 2006

قیمت : -/10 روپے

اردو دنیا

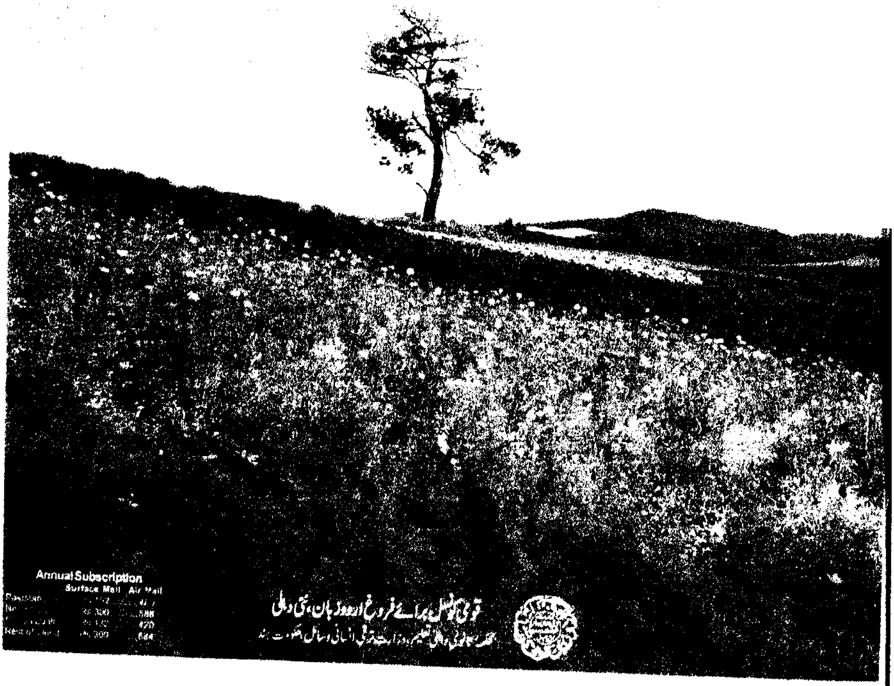

قومی اردو کونسل کی جانب سے کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیر اہتمام حیدرآباد میں چلائے جا رہے کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر برائے خواتین کی کامیاب طالبات کے لیے
11 مارچ 2006 کو جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں جناب محمد جلیل پاشا چیئرمین کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی طالبات کے ساتھ۔

قومی اردو کونسل کی طرف سے انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے اشتراک سے چلائے جانے والے کمپیوٹر سینٹر کے سال 05-2004 کے کامیاب طلبہ وطالبات کو 19 فروری 2006 کو ایک جلسے میں اسناد وانعامات
دیے گئے۔ تصویر میں پروفیسر محمد عبدالحمید اکبر، ڈاکٹر رفیق رہبر (خازن) جناب ولی احمد (چیئرمین مانیٹرنگ کمیٹی) جناب شریف احمد قریشی (صدر انجمن) جناب خواجہ پاشاہ انعامدار (معتمد)
جناب محمد مجیب احمد (معتمد تنظیمی) کے علاوہ جناب محمد ظہیر احمد خاں ((سینٹر سپروائزر) جناب محمد عبدالباسط (فیکلٹی) اور انعام یافتگان کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔8، شمارہ۔5 مئی 2006

مدیر: ڈاکٹر آر۔ کے۔ بھٹ

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26108159, 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26189416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، چھتہ گلی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات 2

ہماری بات 7

روبرو

● منشا یاد سے گفتگو .... اسد فیض 8

زبان اور تعلیم

● کیرالہ میں اردو تعلیم .... پی عبدالغفار 13

● کمپیوٹر کی مدد سے تدریس .... حزل حسین قاسمی 17

سائنس اور ماحولیات

● ختم ہوتے آبی ذخائر .... رؤف ظفر 24

● سنڈے ہو یا منڈے، روز کھائیں انڈے .... عبیدالرحمٰن 26

تاریخ

● پنڈت جواہرلال نہرو کا سفر یورپ .... مدن گوپال 28

شخصیات

● تھامس چین .... اروند گرٹو 31

صحافت

● ہندوستانی میڈیا کا بدلتا چہرہ .... رضوان احمد 33

ادب

● نشتر خانقاہی .... جاوید ندیم 35

● غزلیں .... نشتر خانقاہی 41

ہماری مطبوعات سے

● غزلیں (کلیاتِ فانی سے ماخوذ) .... فانی بدایونی 42

طلبہ کے لیے

● ہاسپٹل مینجمنٹ میں کیریئر .... حنا نقوی 45

● خط و کتابت یا ای میل .... فیروز ہاشمی 47

● ایریز اور اسٹرینگس .... چیت فیر، استوتی تریمان 49

● منزل قریب ہے (باپ کا خط بیٹے کے نام) .... رضوان رضوی 52

اردو خبرنامہ .... ادارہ 55

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 67

بچوں کا گوشہ

● جگدیش چندر بوس ("ہمارے رہنما" سے ماخوذ) .... جے شری پلائی 72

● چھوٹی امی (کہانی) .... لکشمی راج شرما 77

آپ کی بات

■ **یوسف ناظم، 19 الہلال، 13، باندرا ریکلیمیشن، ممبئی-050 400**

مارچ 2006 کے ''اردو دنیا'' کے شمارے کے دونوں مصاحبے مابین بیدار بخت و فیروز عالم اور شاہد حسن کمال و فیاض عالم اس شمارے کی جان ہیں۔ شاہد حسن کمال کو ہندوستان کے اردو داں طبقے سے متعارف کرانے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ موصوف نے ہندوستان اور پاکستان میں لکھی جانے والی اردو کے فرق کو ظاہر کرنے کے سلسلے میں جو باتیں کہی ہیں وہ معلوماتی ہونے کے علاوہ بے حد دلچسپ ہیں۔ اس موضوع کو انھوں نے ایک نئے زاویے سے سمجھا اور سمجھایا ہے۔ دونوں ملکوں میں لکھی جانے والی اور کہی جانے والی نثر اور نظم کا موازنہ متوازن بھی ہے اور واقعاتی بھی۔

بیدار بخت تو شہرۂ آفاق مترجم ہیں۔ جتنے اچھے مترجم ہیں اتنے ہی منکسر المزاج بھی۔ مرحوم اختر الایمان کی شاعری کے ترجموں کی شہرت اور مقبولیت نے ترجمہ نگاری کو بیدار بخت کی شناخت بنا دیا تھا لیکن اس انٹرویو نے انھیں اردو زبان وادب کے ایک معلم اور عملی زندگی میں ایک انجینئر کی حیثیت سے روشناس کیا۔ ان کا یہ جملہ تو میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا'' جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مجھے ایک مہینے کے لیے اردو اور انجینئرنگ میں وزٹنگ پروفیسر کے طور پر مدعو کیا ہے...... اردو کی جزوقتی پروفیسری کی دعوت کو میری انا رد نہیں کر سکی کہ میں تو اردو میں میٹرک فیل بھی نہیں ہوں۔'' اس اعتراف پر دل سے یہ دعا نکلی کہ کاش اردو میں ایسے میٹرک فیل اہل علم و دانش دو چار اور بھی ہوتے۔ میں بیدار بخت کے اسم بامسمیٰ ہونے کا قائل ہو گیا۔

تیسرا مضمون ہمارے دوست محمد حسن فاروقی کا ہے جو لائق تحسین و تشہیر ہے ''مہاراشٹر میں اردو تعلیم'' کو یہاں اتنا پسند کیا گیا کہ اس کی نقلیں ہی نقلیں گردش میں ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اردو زبان کی تعلیم پورے ہندوستان میں اگر دیانت داری کے ساتھ کہیں ہو رہی ہے تو مہاراشٹر میں۔ زبان کا تحفظ بھی اسی ریاست کا کارنامہ ہے۔ اتر پردیش میں اگر اردو کی بیخ کنی کا شہرہ ہے تو اردو کو سرسبز و شاداب رکھنے کا سہرا مہاراشٹر کو ہے۔

آخر میں یہ کیوں نہ لکھ دوں کہ اردو رسائل میں ''اردو دنیا'' اس لحاظ سے مقبول ترین رسالہ ہے کہ اس کی صوری اور معنوی خوبیاں مائل بکمال ہیں۔

■ **ڈاکٹر شمس بدایونی، 58، نیو آزاد پورم کالونی، چھاؤنی اشرف خاں، عزت نگر، بریلی۔ 243122 (یو.پی.)**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آپ نے اس شمارے کو گوشۂ رشید حسن خاں کے طور پر پیش کیا ہے۔ میرے خیال سے اس کی حیثیت تو نمبر کی سی ہے۔ آپ نے اداریے کے علاوہ ہندوستان کے نو(9) بڑے قلم کاروں کے مضامین پیش کیے ہیں۔ دو مضامین رشید حسن خاں کے بھی شامل کیے ہیں۔ لہٰذا اسے نمبر لکھنے میں کیوں تکلف کیا جائے؟ البتہ بعض مضامین خاصے پرانے ہیں اگر ان کے مصنفین سے نظرثانی کرالی جاتی تو بہتر ہوتا۔

آپ نے سرورق پر خاں صاحب کی تصویر کے نیچے اور اندر مضامین میں ان کی وفات کی تاریخ 25 فروری درج کی ہے۔ یہ درست نہیں۔ 26-25 فروری کی درمیانی شب 2:25 پر ان کا انتقال ہوا۔ شمسی کلینڈر کی رو سے شب کے 12 بجے کے بعد دوسری تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا صحیح تاریخ وفات 26 فروری ہے۔

رشید حسن خاں کی موت پر آپ نے ان کے شایان شان نمبر نکال کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کے لیے آپ تمام اردو دنیا کی طرف سے شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

■ **نکہت مختار، پروفیسرز کالونی، محلہ محمد پور، پوسٹ مہیندرو، پٹنہ-6**

''اردو دنیا'' اپنی نیرنگی اور بوقلمونی کے باعث اردو رسالوں میں ایک اہم اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ میں 'اردو دنیا' کا بہت دنوں سے مطالعہ کر رہی ہوں اور پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس نے دنیائے اردو کو وسعت بخشنے میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ سائنس، سماجیات، تاریخ، ادب، کیریئر گائیڈنس، کوئز، بچوں کے گوشہ کے تحت سبق آموز کہانیاں اور دیگر موضوعات پر مضامین کی اشاعت کے ذریعے اس رسالے نے مختلف جواہر ریزوں کو چن چن کر ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو ہمارے لیے کافی معلومات افزا ہیں۔

'اردو دنیا' کے مارچ کے شمارے کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعض مضامین نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ساجدہ زیدی نے اپنے مضمون ''عہد طفلی اور ذہنی آزادی''

میں بچوں کی نفسیات اور والدین اور اساتذہ کی ذمہ داریوں سے واقف کرایا ہے جس پر عمل کر کے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کی جا سکتی ہے۔ سائنس اور سماجیات کے تحت "حکم میرے آقا" بے حد دلچسپ ہے جس میں روبوٹ کے بارے میں جانکاری دی گئی ہے۔ اس ضمن میں مضمون "کم ہوتی بیٹیاں" پڑھ کر عہد جہالت کا شرمناک زمانہ لوٹتا نظر آتا ہے۔

مدن گوپال کا مضمون "اقتدار کی منتقلی" ہندوستانیوں کے اپنے مادر وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد کی داستان ہے۔ اس کا ترجمہ فاخر شبیر عباسی نے جس سلیس زبان میں کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ محمد قاسم صدیقی کی ترجمہ کردہ کہانی "الو کی اداسی" عصر حاضر کے انسانوں کی غفلت کا پیش نامہ ہے۔ چڑیوں کا المناک انجام دیکھ کر غافل دنیا کے انجام کے بارے میں سوچ کر دل سہم اٹھتا ہے۔

سبھی تبصرے معیاری ہیں۔ مجھے خاص طور سے فیروز عالم کا تبصرہ (کتنے پاکستان، کملیشور) بہت عمدہ لگا۔ انھوں نے واقعی تبصرے کا حق ادا کر دیا ہے۔ کملیشور بلاشبہ ہندی کے ایک ممتاز ناول نگار ہیں اور ان کا ناول "کتنے پاکستان" ان کی ایک عظیم تخلیق ہے۔

■ **حسن ظہیر، محلہ مغلپورہ، مئوناتھ بھنجن (یو. پی.) 275101**

"اردو دنیا" عصر حاضر کا باوقار جریدہ ہے۔ میں اسے پابندی سے پڑھتا ہوں کیوں کہ فی زمانہ تعلیم و ثقافت اور سائنسی علوم سے تعلق کے سبب "اردو دنیا" برصغیر کا سب سے منفرد رسالہ بن گیا ہے۔

زیر نظر شمارے کے تمام مشمولات معیاری اور معلوماتی ہیں۔ بیدار بخت سے فیروز عالم کا انٹرویو اور شاہد حسن کمال سے فیاض عالم کی گفتگو خوب ہے۔ اس قسم کے انٹرویو سے بیرونی دنیا کے اردو قلمکاروں اور اردو زبان کے احوال و کوائف کی جانکاری ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سلسلہ برقرار رکھیں تو بہتر ہوگا۔ زبان و تعلیم کے موضوع پر پروفیسر ساجدہ زیدی کا مضمون "عہد طفلی اور ذہنی آزادی" اور محمد حسن فاروقی کا "مہاراشٹر میں اردو تعلیم" اچھی نگارشات ہیں۔ دیگر مضامین بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے کافی کارآمد ہیں۔ "اردو دنیا" کا اردو خبرنامہ بھی کافی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ اردو دنیا کا مقبول ترین رسالہ بنا رہے۔

■ **محمد جہانگیر ملک، کریسنٹ پبلک اسکول، سرسید نگر، کشن گنج (بہار) 855107**

مارچ کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس کا سرورق، ذہن سازی کا غماز ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جموں و کشمیر پر شروع سے ہی ترنگا کا سایہ رہا ہے۔ بڑی ذہانت سے سرورق تیار کیا گیا ہے۔ بقیہ مشمولات معیاری ہیں۔ مجھے ساجدہ زیدی صاحبہ کا مضمون "عہد طفلی اور ذہنی آزادی" بے حد پسند آیا۔ شاید ہی کوئی ایسا گھرانہ ہو جہاں بچے نہ ہوں اور بچوں کی تعلیم کا متمنی شاید ہی کوئی ہو جو بچوں کے روشن مستقبل کا خواہاں نہ ہو، بلکہ اپنی ذہنی کوفت کی خاطر بچوں کو اپنی نظروں سے دور رکھتا ہو۔ ساجدہ زیدی صاحبہ کا مضمون اتنا اچھا ہے کہ یہ ہر خاص و عام کی نظر سے گزرنا چاہیے۔

■ **انوار انصاری، اولڈ ہزاری باغ روڈ، چونا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی (جھارکھنڈ)**

"اردو دنیا" کا مارچ کا شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ شمارہ بہترین اور گراں قدر مضامین سے مزین ہے۔ انجم مانپوری مرحوم کا مزاحیہ مضمون "میر کلو کی گواہی" پڑھ کر ان کی یاد تازہ ہوگئی۔ 1947 میں جب میں گیا کالج کا طالب علم تھا کئی بار مرحوم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ "میر کلو کی گواہی" ان کی ایک لازوال تخلیق ہے۔ اسے کئی بار گیا کے مقامی اسکولوں میں اسٹیج بھی کیا گیا تھا۔

"کم ہوتی بیٹیاں" سماج کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے۔ اظہار احمد ندیم کا ترجمہ کردہ مضمون "حکم میرے آقا" سائنسی ترقی کی ایک درخشاں مثال ہے۔ آج روبوٹ انسانوں کی طرح سارے کام کر سکتے ہیں۔ صفائی کرنے والوں کی طرح فرش صاف کر سکتے ہیں۔ دیوار پر چڑھ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی بھی مدد کر سکتے ہیں جو اپنا کام خود نہیں کر سکتے۔

"روبرو" بھی عمدہ پیش کش ہے۔ فیروز عالم نے بیدار بخت سے ترجمے کے سلسلے میں کئی اہم سوالات کیے ہیں جن کا جواب بیدار بخت صاحب نے سلیقے سے دیا ہے۔ یہی حال شاہد حسن کمال سے فیاض عالم کی گفتگو کا ہے۔ "غالب کی دلّی" شوق سے پڑھا۔ آپ کا انتخاب بھی لاجواب ہوتا ہے۔ طلبہ کے لیے بھی آپ عمدہ سے عمدہ اور معلومات سے پُر مضامین شائع کرتے ہیں۔ "اردو دنیا" کا تبصرہ بھی معیاری ہوتا ہے۔ احمد کفیل، فیروز عالم اور بسمل عارفی کے تبصرے بے حد اچھے لگے۔ آپ کا اداریہ بھی چونکانے والا ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر شہری سخت محنت کرے اور ہر شعبے میں اپنی اخلاقی قدروں کی پاسداری کرے تبھی 2020 تک ہمارا ملک ایک طاقت ور ملک بن کر ابھرے گا۔

■ شاغل ادیب، مشیرآباد، حیدرآباد۔48

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ بابت مارچ باصرہ نواز ہوا۔ اس بار بھی مضامین حسب حال منتخب و قابل قدر ہیں لیکن جناب محمد حسن فاروقی کے مضمون ''مہاراشٹر میں اردو تعلیم'' کے حوالے سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے اردو کے اہم مرکز شولاپور کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ شولاپور نے مہاراشٹر میں اردو ذریعۂ تعلیم کی اہمیت و افادیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ چند سال پہلے یہاں کے اردو ذریعۂ تعلیم کے ایک طالب علم تنویر مہناز نے سارے مہاراشٹر میں اول مقام حاصل کیا تھا۔ چند ہفتہ پہلے ''ہماری زبان'' دہلی میں بھی ایک مضمون ''مہاراشٹر میں اردو'' شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے مہاراشٹر میں اردو کے صرف تین مراکز پونہ، ناگ پور اور اورنگ آباد کا ذکر کیا تھا۔

■ منصور خوشتر، مدیر ''دربھنگہ ٹائمس''، دربھنگہ (بہار)

''اردو دنیا'' کا مارچ کا شمارہ پڑھا۔ اس کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے آپ کی کوششوں کی میں بڑی قدر کرتا ہوں۔ اس رسالے سے نئی نسل کو بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پر مبنی مضامین نئی نسل کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ شمارے میں شامل اسعد فیصل فاروقی کا مضمون ''پہلی ہندوستانی سائنس رپورٹ'' کافی معلوماتی ہے۔ ''اردو دنیا'' کے تمام مضامین معلوماتی ہیں۔ بڑھتے قدم اور کوئز کی اشاعت اردو کے طالب علموں کے لیے بہت مفید ثابت ہو رہی ہے۔ تراجم شائع کرنے کا سلسلہ بھی خوب ہے۔

■ رضوان خاں، سکریٹری بزم اردو، 96، شیخ سرائے، سیتاپور

''اردو دنیا'' کا مارچ کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ سرورق نہایت دلکش اور جاذب نظر ہے۔ مہاراشٹر میں اردو تعلیم کی صورت حال پر جناب محمد حسن فاروقی کا مضمون بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں پر تعلیمی پسماندگی کا الزام لگا کر انھیں نوکریوں اور اہم ذمہ داریوں سے محروم رکھنے والے لوگ اس مضمون اور اس سے وابستہ جدول کا مطالعہ کرنے کی زحمت فرمائیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ پورے ملک سے متعلق اسی قسم کے اعداد و شمار شائع کریں تاکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کی تعلیم سے متعلق لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔ اس شمارے کا مضمون ''کم ہوتی بیٹیاں'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ نام نہاد ترقی یافتہ اور مہذب لوگ کس طرح سے غیر مہذب اور غیر اخلاقی کاموں میں ملوث ہیں، اس مضمون سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ مرحوم خواجہ احمد فاروقی کا مضمون ''غالب کی دلی'' نہایت وقیع ہے۔ اس کے علاوہ ''اردو خبرنامہ'' و دیگر مستقل کالم بھی پسند آئے۔ بچوں کے گوشے کو اگر اور وسعت دی جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔ اس طرح اردو پڑھنے والے کم عمر طلبہ و طالبات ''اردو دنیا'' جیسے اہم اور معلوماتی رسالے سے زیادہ استفادہ بھی کر سکیں گے اور خود کو اس پرچے سے زیادہ وابستہ کر سکیں گے۔

■ مظفر حسین میر، مسجد کوچہ، کاوڈارہ، سری نگر-190002

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' بدستور موصول ہو رہا ہے۔ مارچ کے شمارے میں اردو تعلیم اور سماجی و سائنسی معلومات سے متعلق بہت ہی دلچسپ مضامین ہیں۔ اس شمارے میں ''مہاراشٹر میں اردو تعلیم''، ناصر الدین کی ''کم ہوتی بیٹیاں'' اسعد فیصل فاروقی کی ''پہلی ہندوستانی سائنس رپورٹ'' اور اسپر دھا کا مضمون (ترجمہ: اظہار احمد ندیم) ''حکم، میرے آقا'' میں روبوٹوں سے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرائی گئی ہیں کہ کس طرح یہ ہماری زندگی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ اس شمارے کے آخر میں کہانی ''الو کی اداسی'' بے حد سبق آموز ہے۔

■ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی۔

''اردو دنیا'' کا مارچ کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔

''مہاراشٹر میں اردو تعلیم'' اور ''اقتدار کی منتقلی'' معلوماتی مضامین ہیں۔ ''میر کلو کی گواہی'' بھی دل چسپ مضمون ہے۔ ''غالب کی دلی'' سے بھی میں مستفید ہوا۔ اردو خبرنامہ سے اردو کے پرستاروں کے کاموں کی پوری تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

■ خوشحال زیدی، 80، انتظار لاج، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ ظاہری اور معنوی ہر اعتبار سے رسالہ منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ جس کی مثال عالمی اردو ادب میں نظر نہیں آتی۔ علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی، سائنسی، ادب اطفال غرض یہ کہ کون سا موضوع ہے جو ''اردو دنیا'' میں نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ رسالہ آٹھ سے اسّی برس تک کے قارئین کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ شعری و نثری ادب کا ہر مضمون معیاری اور مثالی ہے۔

■ اقبال نیازی، 40/18، قریش نگر، کرلا، ممبئی۔070 400

''اردو دنیا'' برابر موصول ہو رہا ہے، ہر شمارہ ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے میں نے تو اپنی ذاتی لائبریری میں پرانے شمارے بھی محفوظ کر رکھے ہیں۔ ادب کے ساتھ ساتھ اگر کچھ صفحات فن و ثقافت کے لیے بھی مختص کیے جائیں تو رسالہ ہمہ رنگ خصوصیات کا حامل ہو جائے گا۔

ہماری کوشش ہے کہ رسالے میں ہر موضوع پر معیاری مضامین شائع کیے جائیں۔ آئندہ فن و ثقافت پر بھی مضمون شائع کیا جائے گا۔ (ادارہ)

■ **بھگوان داس اعجاز۔ ڈی، 451، بلجیت نگر، نئی دہلی۔ 110008**

"اردو دنیا" پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ مارچ کے شمارے کے تمام مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ ساجدہ زیدی کا "عہد عقلی اور ذہنی آزادی" اور خواجہ احمد فاروقی کا مضمون "غالب کی دلّی" دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ انجم مانپوری کا "میر کلّو کی گواہی" پڑھ کر تیس ہزاری کورٹ کا نقشہ ذہن میں آ گیا۔

■ **محمد عثمان علی نگری، مکان نمبر 7-5/37، ضلع کرشنا، آندھرا پردیش**

"اردو دنیا" مارچ کا نفیس و تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ یہ رسالہ پوری ادبی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ آپ بھی لوگ قابل ستائش ہیں جو اردو کی ترویج و ترقی میں محنت اور لگن سے مصروف ہیں۔ تمام مشمولات اور مختلف مستقل کالموں میں انفرادیت دیکھ کر آپ کی وسیع النظری اور جاں فشانی کا ہر اردو داں قائل ہو جاتا ہے۔ ہمارا علاقہ تیلگو کا ہے۔ تیلگو یہاں کی سرکاری زبان ہے۔ ہمارے یہاں طلبہ اردو پہلی زبان کی حیثیت سے لیتے ہیں اور دیگر مضامین مثلاً حساب، سائنس وغیرہ تیلگو میں پڑھتے ہیں۔

ہمارے ساحلی کرشنا ضلع میں "اردو دنیا" صحرا میں پانی کے چشمے کی مانند ہے۔ "آپ کی بات" "تو آپ کی بات ہے" "ہماری بات" بھی قابل غور و قابل عمل ہے۔ ادارے کی جانب سے "اردو خبرنامہ" اور کتابوں پر تبصرے معلوماتی ہیں۔ محمد قاسم صدیقی کا الوحسن نظامی کے الوجیبا ہے۔ یہ بچوں کے لیے اچھا مضمون ہے۔ ساجدہ زیدی کا مضمون "عہد عقلی اور ذہنی آزادی" معلومات سے پر ہے۔ محمد حسن فاروقی کا مضمون "مہاراشٹر میں اردو تعلیم" پڑھ کر "آندھرا پردیش میں اردو تعلیم" مضمون پڑھنے کے لیے دل بے چین ہو رہا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کا مضمون "غالب کی دلی" قابل ستائش ہے۔

■ **محفوظ عالم، بھتانی، اتری ضلع گیا (بہار)**

"اردو دنیا" مارچ کا شمارہ موصول ہوا۔ میں 2004 سے ہر ماہ "اردو دنیا" خرید کر پڑھ رہا ہوں اور پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ اس سے پہلے مجھے اردو لکھنا پڑھنا بہت کم آتا تھا لیکن اب میں اردو سیکھنے پر محنت کر رہا ہوں۔ اس ضمن میں یہ رسالہ بے حد معاون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج "اردو دنیا" نے رسالوں کی دنیا میں اپنا اہم مقام بنا لیا ہے۔ اس کی قیمت بھی مناسب ہے۔ ہر طبقے کے سب لوگ اسے پڑھتے ہیں۔ میں نے اردو ڈپلوما کورس میں بھی داخلہ لے لیا ہے۔ میں اپنے سبھی دوستوں کو بھی اردو سیکھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

■ **انوار رضوی، 28C/A-10، کالکاجی ایکسٹنشن، نئی دہلی۔ 110 019**

فروری کا "اردو دنیا" دیکھا۔ خوب ہے۔ صفحہ 66 پر اعزازات و انعامات کے کالم میں تحریر ہے۔ "......... ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا۔"

اردو سو فیصد سیکولر زبان ہے مگر اس کی بنت میں شامل درباریت آج کے جمہوری دور میں بھدی لگتی ہے۔ ادارے ادیب کو نوازتے نہیں ہیں بلکہ (انعام وغیرہ) پیش کرتے ہیں۔

■ **زیبا لطیف، 73 پھول والان، بریلی۔**

"اردو دنیا" کے فروری کے شمارے میں مدن گوپال کے مضمون "1857 کا انقلاب" کے ترجمے میں صفحہ 36 کالم 2 کی آخری سطر میں بندیلکھنڈ کی جگہ روہیلکھنڈ ہونا چاہیے۔ نواب خان بہادر خاں نے 1857 کی جنگ آزادی میں روہیلکھنڈ کی قیادت کی تھی جس کی پاداش میں ان کو انگریزوں نے 2 مارچ 1860 کو پھانسی دے دی تھی۔

■ **محمد ہاشم عادل، پہلی منزل، 2۔اے، نور علی لین، پوسٹ امتالی، کلکتہ 014 800 (مغربی بنگال)**

فروری کا "اردو دنیا" دستیاب ہوا۔ رسالہ مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اگر ہمیں اردو زبان کو زندہ رکھنا ہے تو ہمیں اس زبان کو وسیلے کے طور پر استعمال کرنا ہوگا ورنہ ہماری مخصوص ثقافت رسم الخط اور تشخص ختم ہو جائے گا۔ عبدالودود انصاری کا مضمون بعنوان "معذور انسان اور کامیاب شخصیت" نہایت ہی دلچسپ ہے۔ مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ اگر معذور انسان اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرے تو وہ زندگی کے میدان میں ایک کامیاب اور مثالی شخصیت بن سکتا ہے۔ آپ اس طرح کے مضامین شائع کر کے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

■ **راشد جمال فاروقی، سی۔1452، آئی ڈی۔ پی ایل ٹاؤن شپ، ویربھدر، رشی کیش، ضلع دہرادون۔249202 (اترانچل)**

"اردو دنیا" اپنے بے حد قیمتی مشمولات کی وجہ سے ہر ذی ہوش قاری کی ضرورت بن گیا ہے۔ محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب کا مضمون "اسکول کی تعلیم کے ذریعے ہندوستان میں اردو کی بقا کی حکمت عملی"، مدن گوپال صاحب کا مضمون "ٹیپو سلطان کی شکست"، فرحت اللہ بیگ کا انشائیہ "پلنا"، کملیشور کی کہانی "آزادی مبارک"، وہاب اشرفی صاحب کا انٹرویو، آل احمد سرور کی نظم وغیرہ قارئین کے ذوق مطالعہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

■ **سراج انور مصطفےٰ آبادی، محمدیہ چوک، شیرپور، ضلع دھولیہ (مہاراشٹر)**

نئے سال کا شمارہ اپنی آب و تاب کے ساتھ پہنچا۔ مستقل کالم "اتہاس کے جھروکے سے" بہت خوب ہوتا ہے۔ تازہ شمارے میں "ٹیپو سلطان کی شکست" بہت صحیح جائزہ پیش کرتا ہے۔ اردو خبرنامہ اور گوشۂ ادب نہایت مفید معلومات پیش کرتے ہیں۔ اردو دنیا کی کامیابی و ترقی میں آپ کی کوشش قابل ستائش ہے۔

■ **عبیدالرحمن، ایم۔2، ریگل بلڈنگ، گلی نمبر۔6، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025**

اس بار مختلف کالم دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ نے سائنس اور صحت جیسا کالم شروع کرکے اپنی سائنس دوستی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ویسے آپ اس سے قبل بھی سائنس کے مضامین شامل اشاعت کرتے آئے ہیں بلکہ ایسی تحریروں کو اولیت بخشی ہے۔

■ **ظفر انصاری ظفر، 265، بیریاز ہاسٹل، جے۔این۔یو، نئی دہلی۔**

فروری کا "اردو دنیا" موصول ہوا۔ تمام مشمولات کو بغور پڑھا۔ واقعی یہ رسالہ روز بروز ترقی کی منزلوں سے ہمکنار ہوتا جارہا ہے اور اس کے لیے مجلس ادارت کے تمام افراد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس بار کے مشمولات میں خواجہ اکرام کا مضمون تجزیاتی نوعیت کا ہے، ساتھ ہی یہ مفید اور معلوماتی بھی ہے۔ علاوہ ازیں شہاب الدین انصاری، عبدالودود انصاری، محمود الرحمن اور خسرو متین کے مضامین بھی اچھے لگے۔

■ **رضوان خاں، سکریٹری، 96 شیخ سرائے سیتاپور۔(یو۔پی۔)**

"اردو دنیا" پابندی کے ساتھ مطالعے میں رہتا ہے۔ اس موقر پرچے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں متعدد شعبہ جات زندگی اور مختلف علوم سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں مثلاً ادب، مذہب، سائنس، ریاضی، سماجی علوم وغیرہ۔ "اردو دنیا" ہمیں اردو سے وابستہ تمام تحریکوں اور تقریبات کی جانکاری دینے میں بھی کامیاب ہے۔ "اردو خبرنامہ" اس معاملے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

■ **سرور ساجد، لیکچرر، شعبۂ اردو، رانچی (جھارکھنڈ)**

جنوری کا "اردو دنیا" میرے سامنے ہے۔ حسب سابق رسالہ نہ صرف یہ کہ صوری و معنوی اعتبار سے قابل توجہ ہے بلکہ دن بہ دن خوب سے خوب تر کی طرف بہر اعتبار گامزن ہے۔ جنوری کے شمارے میں شمس الرحمن فاروقی صاحب کا مضمون "اسکول کی تعلیم کے ذریعے ہندوستان میں اردو کی بقا کی حکمت عملی" کئی نہج پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے اور اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ فاروقی اپنا کام وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں دوسرے تھک ہار کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ مضمون نہ صرف سنجیدگی کے ساتھ اردو کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے بلکہ صحیح سمتوں سے غیر جذباتی طور پر ہمیں روشناس کرانے میں بھی کامیاب ہے۔

شہاب ظفر اعظمی نے وہاب اشرفی صاحب سے مختصر مگر جامع انٹرویو لیا ہے۔ وہاب اشرفی صاحب نے جمالیاتی اقدار، تنقید کی زبان سے لے کر مابعد جدیدیت تک مختلف مسائل پر بہت کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔

■ **عابد انور، شانتی نگر، گڑھاٹولی، رانچی (جھارکھنڈ)**

"اردو دنیا" جنوری کے شمارے کے سرورق پر محترم مخمور سعیدی کا ایک عمدہ شعر سال نو کی مبارک باد کے سلسلے میں درج ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غروب آفتاب ہی طلوع آفتاب ہے۔ شام کے بعد ہی سحر نمودار ہوتی ہے۔ یہ آپ نے بالکل سچ لکھا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہر ہندوستانی کی زبان ہے۔ وقت کے ساتھ اردو کی طرف عوامی رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہ انتہائی مسرت کی بات ہے۔

□□□

مراسلات اور مضامین صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں۔
(ادارہ)

ہماری بات

قومی اردو کونسل کو ملک میں اردو کے مقتدرہ کی حیثیت حاصل ہے۔ کونسل اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور تعلیم کے فروغ کے لیے روز اوّل سے کوشاں ہے اور مختلف منصوبوں پر کامیابی سے عمل درآمد کر رہی ہے۔ ان منصوبوں میں اردو زبان اور اس کے بولنے والوں کو جدید ٹیکنالوجیکل منظرنامے سے ہم آہنگ کرنا، انھیں روزگار کے مواقع فراہم کرنا، اردو زبان اور رسم الخط سکھانا نیز اردو کے کلاسیکی ادب کی اشاعت کے علاوہ ادب اطفال، لغات، حوالہ جاتی کتابیں، عالمی کلاسک، سائنس اور ٹیکنالوجی اور انسانی علوم کی تمام شاخوں سے متعلق کتابوں کی اشاعت وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ بالا کاموں کی انجام دہی کے علاوہ کونسل نے اردو لسانی فرقے کو باہم مربوط کرنے کے لیے ملک کی تمام ریاستی اردو اکادمیوں کے اشتراک و روابط میں اضافہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے تاکہ فروغ اردو کی پالیسیوں کو زیادہ بامعنی بنایا جاسکے۔ اس سلسلے میں کونسل کی سربراہی میں اب تک پانچ کانفرنسیں منعقد ہوچکی ہیں۔ ریاستی اردو اکادمیوں کی پانچویں کانفرنس چنڈی گڑھ میں گذشتہ تین اور چار مارچ 2006 کو منعقد ہوئی جس میں کونسل اور ریاستی اردو اکادمیوں کے مابین روابط پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ کونسل کی آئندہ ایگزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ میں بھی اس کی نوعیت پر غور کیا جائے گا۔ ان کانفرنسوں کا مقصد یہ ہے کہ تمام ریاستی اردو اکادمیوں اور کونسل کے مابین ایک مشترکہ حکمت عملی کے تحت اردو کے کاز کو ملک گیر پیمانے پر آگے بڑھایا جاسکے۔ کونسل کی مختلف اسکیموں مثلاً کمپیوٹر سینٹروں کا قیام، کتابوں کی تھوک خریداری، مسودات کی اشاعت وغیرہ کے لیے حسب ضوابط مالی تعاون دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف اکادمیاں اپنی اسکیموں کے تحت جو گرانٹ دیتی ہیں اگر وہ کونسل کی کسی اسکیم کے تحت آتی ہیں تو کونسل یہ گرانٹ اپنی طرف سے دے دیتی ہے تاکہ اکادمیاں اس مد کی رقوم کو فروغ اردو کے دیگر منصوبوں میں صرف کرسکیں۔ قومی اردو کونسل اور اردو اکادمیوں کی اس مشترکہ حکمت عملی کا ہی نتیجہ ہے کہ ریاست کیرالہ اور تمل ناڈو میں اردو اکادمیوں کا قیام عمل میں آسکا اور بعض دیگر ریاستوں میں جہاں اردو اکادمیاں نہیں ہیں ان کے قیام کی کوششیں جاری ہیں۔ کونسل ایک ایسی حکمت عملی بھی وضع کرنا چاہتی ہے جس سے تمام اردو اکادمیاں اپنی اپنی ریاستوں میں اردو زبان کی ترویج و ترقی اور حکومت کی تعلیمی پالیسیوں کے نفاذ کے لیے قومی اردو کونسل کی ریاستی شاخ کے طور پر کردار ادا کرسکیں۔

ریاستی اردو اکادمیوں نے ریاست کے مصنفین کی مالی معاونت، کتابوں کی اشاعت، سیمینار، ورکشاپ اور مشاعروں کے انعقاد کے علاوہ دیگر ثقافتی پروگراموں کے انعقاد، ہونہار طالب علموں اور کارگزار اساتذہ کی حوصلہ افزائی، اردو سکھانے کے لیے سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورس اور کتابت اور کمپیوٹر کے تربیتی مراکز کے قیام کے ذریعے اردو زبان و ادب اور اردو تعلیم کے فروغ کی کوششیں کی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اکادمیاں ایک منضبط لائحہ عمل کے تحت فروغ اردو کے مشن کو آگے بڑھائیں۔ اس ضمن میں کوشش کی جائے کہ صرف معیاری کتابوں پر ہی انعام دیے جائیں، اہم موضوعات پر ہی سیمینار کرائے جائیں اور زیادہ رقم اردو سکھانے، اردو طلبہ کی ضرورتوں کے مطابق کتابیں شائع کرنے، ضرورت مند طلبہ کی مالی معاونت کرنے، اپنی ریاست کی مستند ادبی تاریخ لکھوانے، اہم رسائل کے اشاریے تیار کرانے اور اپنی ریاست کے مخصوص حالات و ضروریات کے مطابق فروغ اردو کے دیگر پروگرام چلانے پر خرچ کی جائے۔ اس سلسلے میں ایک اہم کام یہ ہوسکتا ہے کہ تمام اردو اکادمیاں اپنے اپنے علاقے کی مقامی زبانوں پر کام کرائیں اور ان الفاظ کی نشاندہی کریں جو معیاری اردو میں استعمال نہیں ہوتے تاکہ ایک ایسی مستند لغت ترتیب دی جاسکے جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی اردو کے وہ الفاظ بھی شامل ہوں جن سے معیاری اردو والے یا تو ناواقف ہیں یا ان کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ یہ لغت کونسل کی جانب سے یا اس کے تعاون سے شائع کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے شعر و ادب کا ترجمہ بھی اردو میں شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو والے دیگر زبانوں کے شعر و ادب سے بھی استفادہ کرسکیں۔

اکادمیاں قومی خواندگی مشن میں شریک ہوں اور قومی اہمیت کے حامل مشترکہ علمی پروجیکٹ کونسل اور اکادمیاں مشترکہ طور پر چلائیں۔ ریاستی اردو اکادمیاں متعلقہ ریاستوں میں اردو میڈیم اسکولوں اور اردو کے دیگر اداروں سے متعلق اعداد و شمار جمع کریں اور مذکورہ اداروں کو درپیش مسائل کا بھی جائزہ لیں۔ ان تمام امور میں کونسل اپنی جانب سے پوری معاونت کرسکتی ہے۔

اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب اور تعلیم کی خاطر خواہ ترویج و ترقی کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ کونسل اور ریاستی اردو اکادمیاں ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے کام کریں۔ ان منصوبوں پر موثر عمل درآمد کے لیے ضروری ہے کہ ریاستی اردو اکادمیوں کی رابطہ کمیٹی تشکیل دی جائے جو تمام اکادمیوں سے مسلسل تال میل رکھے اور کونسل کو بھی اپنی سرگرمیوں سے باخبر رکھے تاکہ ملک میں اردو کے ہمہ جہت فروغ کو ممکن بنایا جاسکے۔

□□□

اسد فیض

منشا یاد سے گفتگو

منشا یاد کا شمار اردو کے سینئر لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے 1950 کی دھائی کے آخر میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ اب تک ان کے دو سو سے زائد افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع دیہی تمدن ہے۔ جدید زمانے میں جب کہ شہروں کی دلکشی میں اضافہ ہو رہا ہے، دیہات کی زندگی اور کسانوں کے مسائل عدم توجھی کا شکار ہیں۔ منشایاد نے اس کلچر کو اپنے افسانوں میں تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ پریم چند اور احمد ندیم قاسمی کی روایت کے امین ہیں لیکن معاصر زندگی کے دیگر مسائل بھی ان کے افسانوں کا موضوع بنے ہیں۔ منشا یاد سے گفتگو قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہے۔

سوال: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: میری پیدائش ضلع شیخو پورہ (پنجاب) کے ایک گاؤں ٹھٹہ نستر نزد منڈی فاروق آباد میں ہوئی۔ اسکول اور سروس کے ریکارڈ میں میری تاریخ پیدائش یکم اپریل درج تھی، جو درست نہیں تھی۔ والدین کو انگریزی کی تاریخ یاد نہیں تھی مگر اتنا ضرور یاد تھا کہ وہ سال 1937 کی عید الفطر کا دن تھا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ پانچ ستمبر تھی۔ میں اب اسی کو صحیح مانتا اور کتابوں میں لکھتا ہوں۔

سوال: آپ نے کہاں تعلیم حاصل کی؟

جواب: ابتدائی تعلیم قریبی گاؤں گجیانہ نو میں حاصل کی۔ اس کے بعد حافظ آباد کے ایم. بی. ہائی اسکول نمبر 1 میں داخلہ لیا اور 1955 میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ اسکول آف انجینئرنگ میں داخل ہو گیا اور 1957 میں سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا۔ چوں کہ اردو ادب پڑھنے اور کہانیاں لکھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا اس لیے ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے فاضل اردو، بی.اے.، ایم.اے. اردو اور ایم.اے. پنجابی کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے۔

سوال: کن اداروں میں ملازمت کی؟

جواب: پہلی دو سالہ ملازمت پی ڈبلیو ڈی (پنجاب) کے محکمۂ بحالیات میں کی اور راولپنڈی اور مری میں تعینات رہا۔ اس کے بعد 1960 میں دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے (سی.ڈی.اے.) اسلام آباد میں ملازمت شروع کی اور مختلف عہدوں پر کام کرنے اور ترقی پانے کے بعد ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے سے 1997 میں سبکدوش ہوا۔

سوال: آپ نے افسانہ نگاری کا آغاز کب کیا اور پہلا افسانہ کب شائع ہوا؟

جواب: یوں تو میں نے چھٹی ساتویں جماعت ہی میں بچوں کے رسالوں میں کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دی تھی لیکن پہلا افسانہ دسویں جماعت کا امتحان دینے کے فوراً بعد 'کنول' کے عنوان سے لکھا جو اس زمانے کے ایک نیم ادبی مگر مقبول ترین رسالے 'شمع' لاہور میں شائع ہوا۔ اس کے بعد میرے افسانے ماہ نامہ ''عکس نو'' لاہور میں شائع ہونے لگے۔ لیکن یہ ابتدائی مشق کا دور تھا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میری ادبی زندگی کا اصل آغاز اس افسانے سے ہوا جس کا عنوان 'کہانی' تھا اور جو میں نے 1957 میں لکھا مگر یہ 1959 میں اشفاق احمد صاحب کے رسالے'' داستان گو'' میں شائع ہوا تھا۔

سوال: اب تک آپ کے کتنے افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں؟

جواب: اب تک میرے افسانوں کے نو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ایک پنجابی افسانوں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔ پنجابی میں ایک ناول ''ٹانواں ٹانواں تارا'' 1997 میں شائع ہو چکا ہے۔ ان سب کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1. بند مٹھی میں جگنو (1975)
2. ماس اور مٹی (1980)
3. خلا اندر خلا (1983)
4. وقت سمندر (1986)
5. وگدا پانی (پنجابی) (1987)
6. درخت آدمی (1990)
7. دور کی آواز (1994)
8. تماشا (1998)
9. خواب سرائے (2005)

ناول: زیرِ طبع: 1۔ راہیں 2۔ آواز

متعلقہ کتب انتخابات رسائل:

1. منشایاد کے تیس منتخب افسانے مرتبہ خاور نقوی 1992 (پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، لاہور)
2. منشایاد کے بہترین افسانے مرتبہ امجد اسلام امجد 1993 (ادب پبلی کیشنز۔ نئی دہلی)

3. منتخب کہانیاں (انگریزی تراجم) مرتبہ جمیل آذر 1994 (اسٹرلنگ پبلشرز۔نئی دہلی اور لاہور۔

4. منشایاد کہانی نمبر" لہراں" لاہور 1986

5. شہر فسانہ (خود منتخب کردہ پچاس افسانوں کا انتخاب) 2004

اس کے علاوہ میں نے افسانوں کے کچھ انتخابات بھی مرتب کیے ہیں اور بچوں کے لیے لکھی گئی ناقہ رحیم الدین کی کتاب کا پنجابی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

سوال: آپ نے افسانے کو ہی اظہار کے لیے کیوں منتخب کیا؟

جواب: میں نے شروع میں شاعری بھی کی مگر ناول اور افسانے سے میری دلچسپی زیادہ تھی۔ ناول لکھنے کے لیے زندگی کے تجربے، ریاضت اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو کے زیادہ تر ادیبوں کی طرح میں بھی جز وقتی ادیب تھا اور ملازمت کے دوران میں افسانہ لکھنے کا وقت بھی مشکل سے نکال پاتا تھا۔ کئی بار ناول لکھنے کی کوشش کی مگر عدیم الفرصتی کی وجہ سے ہر بار یہ کوشش ادھوری رہ گئی۔

شروع میں تو افسانے کو اختصار کی سہولت کے پیش نظر ہی اختیار کیا مگر پھر محسوس ہونے لگا کہ یہ بہت عمدہ صنفِ ادب ہے۔ آپ اس میں ہر طرح کے خیالات اور جذبات کا بھرپور اظہار کر سکتے ہیں۔ پھر یہ افسانے ساتھ ساتھ ادبی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ جس سے قارئین کے علاوہ ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور رسائل و جرائد کے مدیروں سے مسلسل تعلق قائم رہتا ہے۔

سوال: کن افسانہ نگاروں کے اثرات آپ کی افسانہ نگاری پر مرتسم ہوئے؟

جواب: جب میں نے افسانہ پڑھنا اور پھر لکھنا شروع کیا تو میں بھی اچھے اور مشہور افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں سے متاثر تھا۔ میں نے ابتدا میں نسیم حجازی کے سارے ناول پڑھ ڈالے۔ مرزا ادیب کے صحرانورد کے خطوط اور رومان اور اس عہد تک چھپے ہوئے سارے اردو ناول پڑھے۔ لیکن جن افسانہ نگاروں کے افسانے میں دل سے پسند کرتا تھا ان میں پریم چند، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور اشفاق احمد شامل تھے۔ میں نے ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ ان کے علاوہ نقوش کے ایک افسانہ نمبر میں آغا بابر کا مشہور افسانہ" گلاب دین چٹھی رساں"" جو توازن" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، احمد ندیم قاسمی کا" بھرم" اور تسنیم سلیم چھتاری اور بہت سے دیگر لوگوں کے افسانے اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس لیے میرے افسانوں پر سبھی کے اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ میں انتظار حسین کے افسانوں کو بھی پسند کرتا ہوں مگر شعوری طور پر میں نے کسی کی تقلید نہیں کی اور نہ ہی کسی سینئر افسانہ نگار کے فکر و اسلوب کے سحر میں گرفتار ہو کر رہ گیا۔

سوال: افسانہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

جواب: میرے نزدیک افسانہ ایک ایسا مختصر نثر پارہ ہے جس میں کسی واقعہ، منظر، خیال، جذبہ، تجربہ، احساس، کردار یا روحانی کیفیت کو ایسے بہترین اور موثر انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ پڑھنے وا[illegible]ات اور کرے اور اس کی یادداشت کا حصہ بن جائے اور اسے زندگی کے معاملات و مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور شعور بخشے۔

سوال: آپ افسانہ کیسے لکھتے ہیں اور کتنے عرصے میں ایک افسانہ مکمل ہوتا ہے؟

جواب: سب سے پہلے مجھے کوئی خیال سوجھتا ہے۔ اس کے بیجوں میں نشوونما کی گنجائش ہو تو ذہن میں فوراً ہی پلاٹ کی تشکیل شروع ہو جاتی ہے۔ کردار سرگوشیاں کرنے اور ان کے مکالمے سنائی دینے لگتے ہیں۔ مگر میں اسے فوراً ہی لکھنے نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اسے ذہن کے اسٹور روم میں ڈال دیتا ہوں جہاں پہلے سے کئی کچے پکے خیالات فالتو سامان کی طرح ادھر ادھر پڑے ہوتے ہیں۔ وہ نیا خیال کبھی خود اور کبھی کسی دوسرے خیال، کردار، واقعہ، تاثر یا احساس سے مل کر نشوونما پانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ انڈے سینے جیسا عمل ہوتا ہے۔ اگر یہ پتھریلے نہ ہوں تو کچھ عرصے بعد انڈوں کے خول توڑ کر بچے باہر نکل آتے ہیں اور ذہن چوں چوں کی آوازوں سے بھر جاتا ہے۔ عام طور پر کچھ روز کے وقفوں سے اس پر نظر ثانی کرتا رہتا ہوں۔ جب اس میں مزید مختصر یا بہتر ہونے کی گنجائش نہ رہے اور میرے اندر کا نقاد مطمئن ہو جائے تو اسے پرنٹ کر لیتا یا ای میل سے کسی ادبی رسالے کو بھیج دیتا ہوں۔

سوال: 1960 میں جدیدیت کے زیر اثر افسانے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: زندگی اور فن کے ارتقائی سفر میں تبدیلیاں اور نئے تجربات ناگزیر ہوتے ہیں۔ ہر تبدیلی اور تجربہ فن کی کسی نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔ میں 1960 کی دہائی میں فن افسانہ نگاری میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ابتدا میں بعض لکھنے والے افراط و تفریط کا شکار بھی ہوئے لیکن مجموعی طور پر جدیدیت کی اس تحریک یا رجحان نے افسانے کو نئی زندگی دی۔

سوال: کیا آپ نے بھی علامتی کہانیاں لکھیں اور ان میں علامتیں قابل فہم تھیں؟

جواب: بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح میری ابتدائی کہانیاں بھی روایتی اور وضاحتی اسلوب کی حامل تھیں۔ لیکن میں بھی عصری افسانے

میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر نہیں تھا۔ اس لیے علامتی اور نیم علامتی بہت سی کہانیاں لکھیں مگر ایک تو یہ قابل فہم تھیں دوسرے ان میں کہانی پن سے کبھی صرف نظر نہیں کیا گیا۔

سوال: کیا علامتی اور تجریدی افسانے جیسے تجربات نے افسانے کی صنف کو نقصان پہنچایا؟

اردو افسانے میں علامت نگاری کوئی نئی چیز تو نہیں تھی، اس کی اولین مثالیں ہمیں ابتدائی دور کے افسانوں میں بھی ملتی ہیں بلکہ دیکھا جائے تو داستانوں اور اساطیری کہانیوں کے دیو، پریاں، بھوت، بیتال، آفات، جادوگر اور توتے مینا بھی علامتیں ہی تھیں۔ یلدرم سے لے کر منٹو تک کئی افسانہ نگاروں کے ہاں اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ لیکن بحیثیت ایک تحریک یا رجحان کے علامت نگاری کو 1960 کی دہائی ہی میں فروغ ملا۔ کافکا اور دوسرے فرانسیسی افسانہ نگاروں کے زیر اثر اردو افسانے میں بھی علامت اور تجرید کا استعمال شروع ہوا۔ ہندوستان میں اس کا آغاز سریندر پرکاش اور بلراج مینرا اور پاکستان میں انتظار حسین اور انور سجاد نے کیا۔ اگرچہ انتظار حسین کی علامت نگاری کی نوعیت ذرا مختلف تھی کہ ان کہانیوں کی فضا، مواد اور اسلوب اساطیری کہانیوں سے متاثر و ماخوذ تھا۔ دوسروں کے ہاں جدیدیت علامت، استعارے اور تجرید کے استعمال و امتزاج اور اسلوب کی تازہ کاری سے آئی۔ مگر بعض افسانہ نگاروں نے لسانی تشکیلات کی آڑ میں بے ڈھب اور مہمل جملے بازی کو جدیدیت سمجھ لیا۔ کردار، پلاٹ اور کہانی پن کو نظر انداز کیا جانے لگا جس سے افسانہ روکھا پھیکا اور بے ربط ہو گیا۔ مگر 1970 کی دہائی کے بعد صورت حال تبدیل ہو گئی اور نئے تجربوں میں پختگی اور استحکام آیا اور ایک متوازن اور معتدل رجحان وجود میں آیا جس میں روایتی افسانے کی خوبیاں بھی تھیں اور جدیدیت کی بھی۔ جو باہر سے ہی نیا نہیں تھا اندر سے بھی یعنی فکری لحاظ سے بھی جدید تھا۔ نئے تجربوں کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ ان سے افسانے کا کینوس وسیع ہوا۔ افسانے کو غیر ضروری اور طولانی تمہید، خارج کے وضاحتی اور صراحتی بیان اور بے وصف نثری اسلوب سے رہائی ملی۔ اس طرح ان تبدیلیوں نے فن افسانہ نگاری کو نئی زندگی دی۔

سوال: افسانے میں بیانیہ کی واپسی کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: اردو افسانہ تجربوں اور تبدیلیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر دوبارہ اپنی ڈگر پر آ گیا ہے۔ لیکن یہ ڈگر عین مین وہی نہیں ہے جسے چھوڑ کر اس نے تجربوں کا سفر شروع کیا تھا۔ واپسی میں اس کے ساتھ بہت کچھ نیا بھی آیا ہے۔ اس لیے یہ خوش آئند بات ہے کہ پلاٹ، کردار اور کہانی کو افسانے میں دوبارہ استحکام حاصل ہوا۔ دراصل فن افسانہ نگاری بنیادی طور پر بیانیہ ہی ہے۔ مگر نئے تجربوں نے بیانیہ کی صورت بھی تبدیل کر دی ہے اور بہت سے نئے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ اب افسانہ پہلے سے زیادہ متنوع، عمیق اور توانا ہو گیا ہے۔

سوال: آپ کے افسانوں کے موضوعات کیا ہیں؟

جواب: افسانے کا عام طور پر کوئی ایک موضوع نہیں ہوتا۔ میرے افسانوں کے موضوعات بھی مخصوص نہیں، متنوع ہیں۔ میں انسانی زندگی کے سارے ہی پہلوؤں اور رخوں کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیہاتی اور شہری زندگی کے مختلف پہلو، فرد اور معاشرے کے داخلی اور خارجی معاملات و مسائل اور فکر و خیال کے متنوع رنگ۔ یوں انسانی زندگی کا سب سے بہترین موضوع محبت ہے اور میں نے بھی اس پر بہت سی کہانیاں لکھی ہیں مگر کسی بھی سماجی نفسیاتی اور سیاسی موضوع کو شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھتا۔ تاہم عام آدمی کے دکھ سکھ، ماحول کی گھٹن، سیاسی جبر اور طبقاتی تقسیم سے متعلق موضوعات میرے بہت سے افسانوں کا موضوع بنے۔

سوال: کوئی ایسی کہانی جو آپ ابھی لکھنا چاہتے ہوں؟

جواب: ایک نہیں ابھی میں بہت سی کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔ ہزاروں کہانیاں پڑھیں، سیکڑوں لکھیں مگر ایک بڑا اور ناقابلِ فراموش افسانہ لکھنے کی خواہش میں مسلسل مشق کرتا رہتا ہوں۔ ابھی میرے اندر کہانیوں کا بہت بڑا انبار ہے، اتنا بڑا کہ ان سب کا لکھا جانا ایک زندگی میں ممکن نہیں۔ اس کا حل میں نے یہ سوچا کہ افسانچے لکھنا شروع کر دیے ہیں تاکہ وہ کہانیاں بھی کسی طرح محفوظ کر سکوں جنھیں لکھنے کے لیے میں پورا وقت نہیں نکال پا رہا ہوں۔

سوال: افسانے میں کس کی ساخت پر آپ کی زیادہ توجہ مرکوز رہتی ہے کرداروں پر یا اسلوب پر؟

جواب: اسلوب ایسی چیز نہیں ہے کہ اس پر ہمہ وقت توجہ مرکوز رکھی جائے۔ اس کا تعین افسانہ شروع کرتے وقت ہی ہو جاتا ہے۔ پھر افسانہ مکمل کرنے کے بعد آپ نظر ثانی کرتے ہوئے زبان و بیان کی خامیاں اور اسلوب کی کمزوریاں دور کر سکتے ہیں۔ میری زیادہ تر توجہ اس خیال یا موضوع کی طرف ہوتی ہے جس کی خاطر میں افسانہ لکھتا ہوں۔ کردار تو ذریعہ ہوتے ہیں جو لکھنے والے کی بات قاری تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن کرداروں پر پوری توجہ نہ دینے سے کردار مصنوعی اور جھوٹے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں ایک اچھے افسانے کے ضروری عناصر کیا ہیں؟

جواب: ایک اچھے اور مکمل افسانے میں سارے ہی عناصر اور اجزا موضوع، پلاٹ، اسلوب، کردار نگاری، منظر نگاری، نقطۂ نظر، ہیئت اور تکنیک وغیرہ ضروری ہوتے ہیں اور ان میں توازن ہونا چاہیے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں سب سے اہم وہ خیال یا موضوع ہے جس کو بنیاد بنا کر یا جس کی بنیاد پر افسانے کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ آپ اسے مرکزی خیال بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کا تاثر ابھارنے کے لیے افسانہ نگار کردار اور ماحول تخلیق کرتا اور اسی کے مطابق زبان و بیان اختیار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کی کچھ خصوصیت اور پہچان ہے۔ یوں افسانہ نگار کو فن اور فکر کے سارے پہلوؤں پر توجہ رکھنا ہوتی ہے افسانے کی سرخی یا عنوان سے لے کر اس کے آخری جملے یا اختتامیے تک۔ مثلاً عنوان یاد رہ جانے والا اور بامعنی ہو۔ آخری جملہ ایسا ہو کہ کسی بات کا انکشاف کرے اور تکمیل کا احساس ہو۔

سوال: اگر آپ کو کہا جائے کہ عالمی افسانے کے انتخاب میں آپ اپنا کوئی افسانہ خود منتخب کریں تو آپ کون سا افسانہ شامل کریں گے اور کیوں؟

جواب: میرے بہت سے افسانے دوسری زبانوں میں ترجمہ اور عالمی افسانوں کے انتخاب میں شامل ہو چکے ہیں جن میں بچے اور بارود، اپنا گھر، ماس اور مٹی، دام شنیدن، (ڈنگر بولی)، ریپلیکا (تاج محل کی سیر)، دیدۂ یعقوب، پھندا اور تماشا وغیرہ بے حد اہم ہیں لیکن ''تماشا'' سرفہرست ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اچھے افسانے کی ساری خوبیاں ہیں۔ اس کا موضوع دلچسپ اور گہری معنویت کا حامل ہے۔ اس میں ترقی پذیر ملکوں کے فرد اور اجتماع کے انسانیت کش رویوں کو پیش کیا گیا ہے۔

سوال: کیا آپ کے افسانوں کے تراجم ہوئے؟

جواب: میرے بہت سے افسانوں کے انگریزی، فارسی، ہندی، فرانسیسی، ترکی، عربی، پنجابی (گورمکھی) زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی تراجم پر مشتمل ایک مجموعہ ''تماشا اینڈ اور اور اسٹوریز'' (Tamasha and other Stories) جسے پروفیسر جمیل آذر نے مرتب کیا تھا، 1994 میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اٹھارہ افسانے شامل تھے۔ اسی سال کچھ اضافوں کے ساتھ یہ ''سلیکٹڈ اسٹوریز آف منشایاد'' کے نام سے پاکستان میں بھی شائع ہوا۔ امرتا پریتم نے اپنے رسالے ''ناگ منی'' (دہلی) کا ''ماس اور مٹی'' نمبر شائع کیا تھا جس میں اس نام کے مجموعے کی بہت سی کہانیاں پنجابی میں ترجمہ کی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ میری اردو کہانیوں کو پنجابی میں ترجمہ کر کے چھاپتی رہتی تھیں۔ افسانہ دام شنیدن (ڈنگر بولی) ہندی اور پنجابی کے علاوہ بھارت کی بعض اور زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا جیسے کنڑ وغیرہ۔

سوال: فکشن کی جو تنقید لکھی جا رہی ہے کیا آپ اس کے معیار سے مطمئن ہیں؟

جواب: پاکستان میں فکشن کی تنقید کے معیار اور مقدار دونوں سے میں زیادہ مطمئن نہیں ہوں۔ ہمارے نقادوں کی زیادہ توجہ نصابی موضوعات اور شاعری تک محدود رہتی ہے۔ ہم عصر افسانے پر بہت کم نقادوں نے توجہ دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے خاصے مطالعہ اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے بہت سے افسانہ نگار خود تنقید لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی افسانے پر اچھی نظر ہے مگر ان کے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نئے افسانوں کو نہیں پڑھتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا تنقیدی کام قابل داد ہے۔ نئے افسانے کو سید وقار عظیم اور ممتاز شیریں جیسے نقادوں کی ضرورت ہے۔

سوال: فکشن کے کس نقاد کے کام کو آپ تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: پاکستان میں ڈاکٹر وزیر آغا نے فکشن کی تنقید پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ انھوں نے اپنے مضامین، مقالات اور رسالہ ''اوراق'' کے ذریعے نئے افسانے کی حوصلہ افزائی، ترقی اور اشاعت کا کام بھی کیا۔ افسانے کی تنقید پر ان کی کتاب بھی موجود ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کی تنقید بہت تخلیقی اور ٹو دی پوائنٹ ہے اور فکشن کے فن کو سمجھنے میں بہت ممد و معاون ثابت ہوئی۔ سلیم آغا قزلباش کا افسانے پر ڈاکٹریٹ کا تھیسس بھی شائع ہو چکا ہے جو خاصا وقیع ہے۔ فتح محمد ملک نے اپنے مضامین میں اردو افسانے اور خاص طور پر منٹو کے فن کے بہت اچھے تنقیدی جائزے پیش کیے ہیں۔ وہ بھی افسانے کو بہت اچھی طرح سمجھنے والے نقاد ہیں۔ اسی طرح محمد علی صدیقی، مظفر علی سید، ڈاکٹر انوار احمد، شہزاد منظر، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا تنقیدی کام قابل توجہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر اعجاز راہی اور ڈاکٹر آصف فرخی نے بھی اردو افسانے کی تنقید میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد کی تنقید بھی نہایت معیاری ہے۔ ہندوستان میں شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور وارث علوی افسانے کے بہت اچھے نقاد ہیں۔ ان دنوں میں وارث علوی کے مضامین کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے ان کی اپروچ درست اور انداز تحریر بہت اچھا اور دلچسپ لگتا ہے۔

سوال: ادبی جرائد دم توڑتے جا رہے ہیں اور سرکاری جرائد کا کوئی معیار نہیں، ایسی صورت حال میں ادب کے فروغ کے لیے کیا اقدامات ہونے چاہییں؟

جواب: ادبی جرائد کہاں دم توڑ رہے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں آئے دن بہت سے نئے، معیاری اور اچھے رسائل کا اجرا ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے نقوش اب پہلے جیسا نہیں رہا بلکہ پتہ نہیں ہے بھی کہ نہیں اور اوراق بھی دیر سے آتا ہے اور کچھ دبلا بھی ہو گیا ہے مگر فنون، سیپ، سویرا، معاصر، ادبِ عالیہ، قومی زبان، بادبان، مکالمہ، ادبیات، دنیا زاد، ارتکاز، بیاض، آج، تشکیل، آئندہ، روشنائی، ادب و ثقافت، ماہ نو، کتاب، جدید ادب، تادیب، الماس (خیر پور یونیورسٹی)، قرطاس (گوجرانوالہ)، نیرنگِ خیال، ادراک (گوجرانوالہ)، آفاق (راولپنڈی)، سورج، الحمرا، نو ادر، ادبِ لطیف، تخلیقی ادب وغیرہ کتنے ہی ادبی رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں ادب کی چالیس سال تک مسلسل خدمت کرنے کے بعد ''شب خون'' بند ہو رہا ہے مگر اس کا دو حصوں پر مشتمل آخری شمارہ جو تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہوگا عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ ذہن جدید، استعارہ، شاعر، شعر و حکمت، نیا سفر، نیا ورق، ادب ساز، سبق اردو وغیرہ بہت سے معیاری ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر جدید ادب اور بہت سے دوسرے اردو رسالے موجود ہیں۔ ان اتنے بہت سے رسائل کی موجودگی میں آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ادبی جرائد دم توڑ رہے ہیں۔ مجھے ادبیات کی حد تک آپ کی اس بات سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ سرکاری جرائد کا کوئی معیار ہی نہیں۔ ماہِ نو کو البتہ توجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔

سوال: افسانے کے علاوہ اور کس صنف میں دلچسپی ہے؟

جواب: ناول کے علاوہ ''یادیں'' کے نام سے یادداشتیں لکھ رہا ہوں۔ ریڈیو اور ٹی.وی. کے لیے ڈرامے اور سیریل بھی لکھ چکا ہوں۔ اخبار میں کالم بھی جاری ہے اور حسبِ ضرورت مضامین بھی لکھتا رہتا ہوں۔

سوال: اردو افسانے کے کس دور کو آپ اس کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں؟

جواب: اردو افسانے کا سنہرا دور تو وہی ایک ہے جب منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، غلام عباس، مرزا ادیب، اشفاق احمد، اوپندر ناتھ اشک، شوکت صدیقی، عزیز احمد، انور عظیم، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، غیاث احمد گدی، قاضی عبدالستار، آغا بابر، بانو قدسیہ، اے.حمید، رام لعل، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین ایک ساتھ افسانہ لکھ رہے تھے۔ البتہ جدید افسانے پر انیس سو ساٹھ ستر کی دہائی میں ایک بار خوب جوبن آیا تھا آپ اسے سنہری نہیں تو نقرئی دور تو ضرور کہہ سکتے ہیں جب انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، جوگندر پال، بلراج مینرا، احمد ہمیش، وقار بن الٰہی، خالدہ حسین، رشید امجد، اعجاز راہی، سمیع آہوجا، مظہر الاسلام، اسد محمد خاں، احمد داؤد، مرزا حامد بیگ، احمد جاوید، غلام الثقلین نقوی، رتن سنگھ، محمد عمر میمن، قمر احسن، نیر مسعود، احمد یوسف، سلام بن رزاق، کلام حیدری، شوکت حیات، انور عظیم، آغا سہیل، محمود احمد قاضی، انور زاہدی، ناصر بغدادی اور بہت سے افسانہ نگار نئی حسیت کے ساتھ ابھرے (چاہیں تو مجھے بھی ان میں شامل کر لیں)۔ اسی طرح افسانے کا تیسرا اور موجودہ دور بھی کم اہم نہیں ہے۔لیکن یہ ابھی جاری ہے۔

سوال: کیا آج ہمارے یہاں معیاری افسانہ لکھا جا رہا ہے؟

جواب: جی ہاں۔ ہمارے یہاں ہر دور میں عمدہ افسانے لکھے جاتے رہے ہیں۔ اب بھی برصغیر بہت اچھے لکھنے والے موجود ہیں اور معیاری افسانے لکھ رہے ہیں۔ نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے پیش نظر افسانے کا وہ سارے فنی اور فکری سفر اور تجربات ہیں جن میں کامیابیاں ہی نہیں ناکامیاں بھی تھیں۔ مگر یہ کامیابیاں اور ناکامیاں نئے راستے متعین کرنے میں ان کی معاونت کر رہی ہیں۔ اس نسل میں محمد حمید شاہد، آصف فرخی، عبدالوحید، اسلم سراج الدین، نکہت سلیم، سلیم آغا قزلباش، نیلوفر اقبال اور شبانہ حبیب جیسے باصلاحیت افسانہ نگار شامل ہیں۔

سوال: اردو میں نئے تنقیدی نظریات مثلاً ساختیات وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا اس سے افسانے کی تفہیم ممکن ہے؟

جواب: جس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادبی اصناف میں نئے اسالیب اور رجحانات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اسی طرح تنقید میں بھی نئے نئے نظریات سامنے آتے رہتے ہیں۔ ساختیات وغیرہ کا نظریہ بھی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور رکھتا ہے اور کسی حد تک افسانے کی تفہیم میں مددگار ثابت بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن پوری تفہیم نہیں کر سکتا۔

سوال: آپ کے کتنے اردو اور پنجابی ڈرامے ٹیلی ویژن پر پیش کیے گئے؟

جواب: میرے بہت سے افسانوں کی ریڈیو اور ٹی.وی. کے لیے ڈرامائی تشکیل ہو چکی ہے۔ پنجابی میں کم، اردو میں زیادہ۔ طبع زاد ڈرامے بھی لکھے۔ جیسے ''کچے پکے رنگ'' اور ''ذرا نم ہو تو'' وغیرہ۔ ٹی.وی. سیریلوں میں جنون، بندھن، راہیں، پورے چاند کی رات، آواز (ابھی ٹیلی کاسٹ نہیں ہوا) اور رنگِ وفا (زیرِ تحریر) شامل ہیں۔ ان میں راہیں پر سال کے بہترین اسکرپٹ کا پی.ٹی وی نیشنل ایوارڈ بھی ملا تھا۔

□□□

پی. عبدالغفار

کیرالہ میں اردو تعلیم
(گریجویشن کی سطح پر)

جنوبی ہند کی چار ریاستوں میں کیرالہ اگر چہ رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے سب سے چھوٹی ریاست ہے۔ لیکن تعلیم کے اعتبار سے یہ ہندوستان کی تمام ریاستوں سے آگے ہے۔ کیرالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تمام مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مکمل مل کر رہتے ہیں۔ صرف مسلمان ہی نہیں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی دلچسپی سے اردو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ یہاں کے اردو پڑھنے والوں میں تقریباً 20 فیصد اور پڑھانے والوں میں تقریباً 30 فیصد غیر مسلم شامل ہیں۔ اس ریاست کی علاقائی زبان ملیالم ہے اور اردو کسی بھی قوم کی مادری زبان نہیں ہے (دکنی، بھٹکلی، پٹھانی وغیرہ جماعتوں کو چھوڑ کر جو آٹے میں نمک کے برابر ہیں)۔ اس لیے یہاں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں اردو مادری زبان کی حیثیت سے نہیں پڑھائی جاتی اور نہ ہی یہاں اردو میڈیم اسکول موجود ہیں۔ بلکہ یہ پانچویں جماعت سے اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

ریاست کیرالہ میں تقریباً 50 سرکاری اور ایک سو سے زیادہ سرکاری امداد یافتہ نجی کالج موجود ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ صرف چھ کالجوں میں اردو کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اب میں کیرالہ کے ان کالجوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جہاں ڈگری کی سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔

کیرالہ کے صرف چھ کالجوں میں گریجویشن کی سطح پر ایک مضمون، دو مضمون، سہ مضمون اور صرف ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو زبان کی تعلیم کا انتظام ہے اور یہ ریاست کی مختلف یونیورسٹیوں سے ملحق ہیں اور اپنی متعلقہ یونیورسٹیوں کے نصابات کے تابع ہیں۔ ان میں سے دو خالصتاً سرکاری کالج، تین سرکاری امداد یافتہ نجی کالج ہیں۔ یہ تینوں نجی کالج مسلم انتظامیہ کے زیر انتظام ہیں۔ ایک اور کالج جہاں گریجویشن کی سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام ہے وہ شری شنکر آچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت کالڑی کا مقامی مرکز کوئی لانڈی ہے۔

سرکاری کالج: ریاست کے دو کالجوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہے جن میں سے ایک کا الحاق کالی کٹ یونیورسٹی کے ساتھ ہے اور دوسرے کا الحاق کنانور یونیورسٹی کے ساتھ ہے۔

امداد یافتہ نجی کالج: ریاست کیرالہ میں یوں تو سرکاری امداد یافتہ نجی کالجوں کی تعداد سرکاری کالجوں سے تقریباً تین گنا زیادہ ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ صرف تین کالجوں میں گریجویشن کی سطح پر صرف ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔

یونیورسٹی کالج: کیرالہ میں ''شری شنکر آچاریہ سنسکرت یونیورسٹی کالڑی'' کے کوئی لانڈی سینٹر میں سہ مضمون اور ثانوی زبانوں کی حیثیت سے اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ متذکرہ کالجوں کی تفصیلات مندرجۂ ذیل ہیں۔

گورنمنٹ کالج ملاپرم: یہ سرکاری کالج ہے جو 1972 میں قائم ہوا۔ اس کا الحاق کالی کٹ یونیورسٹی کے ساتھ ہے۔ شروع سے اس کالج میں ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو تعلیم کا انتظام تھا اور دو اساتذہ درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جب کالج میں ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھنے والوں کا داخلہ مشکل ہو گیا اور اردو اساتذہ کو ملازمت سے بے دخل کرنے کے حالات پیدا ہو گئے تو یہاں کے محبانِ اردو نے جدوجہد کر کے گریجویشن کی سطح پر اردو میں بی۔اے۔ ڈگری کورس شروع کرنے کے لیے سرکار سے منظوری حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح کالج میں 1995 میں گریجویشن کی سطح پر ایک مضمون یعنی (Single Main) کے طور پر اردو پڑھنے اور پڑھانے کی اجازت مل گئی۔ جو یہاں کے محبانِ اردو کی ایک دیرینہ خواہش تھی۔ اس طرح اب اس کالج میں اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو یا بارھویں میں اردو بحیثیت ثانوی زبان اردو پڑھ کر آنے والے بچوں کو آسانی سے داخلہ ملنے لگا اور اردو اساتذہ کی ملازمت بھی برقرار رہی۔ اس کالج سے اب تک 8 بیچ اردو بی۔اے۔ کی ڈگریاں لے چکے ہیں۔ اس ڈگری کورس کا نصاب کالی کٹ یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے۔ جس میں کل آٹھ پرچے پڑھائے جاتے ہیں۔ جن میں پہلا پرچہ نثر اور ڈراما پر مبنی ہے یہ سالِ اول میں پڑھایا جاتا ہے۔ دوسرا پرچہ جدید شاعری ہے جو سالِ دوم میں پڑھایا جاتا ہے۔ تیسرا پرچہ فکشن، چوتھا پرچہ تاریخ ادب اردو اور ادبی تنقید، پانچواں اردو غزل، چھٹا فنکشنل اردو، ساتواں سیرت اور تاریخ اور آٹھواں پرچہ تاریخ ہند ہے۔ اس کے علاوہ اس کورس میں ثانوی زبان کی حیثیت سے بھی اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ اس کے بھی تین پرچے ہیں۔ سال اول کے طلبہ کے لیے پہلا پرچہ نثر اور سال دوم میں دوسرا پرچہ شاعری اور قواعد اور تیسرا پرچہ ترجمہ اور کمپوزیشن (Non-detailed, Translation and Composition) پڑھایا جا رہا ہے۔ ثانوی زبان کے یہ تینوں پرچے ڈگری کورس کے دیگر طلبہ (مثلاً معاشیات، تاریخ، طبعیات اور کیمیا) کے لیے مشترک ہیں۔ یہی نہیں یہاں کی خاص بات جو عام طور پر دوسری ریاستوں میں نہیں ہے وہ یہ ہے کہ بی.کام (B.Com) کے طلبہ کے لیے ثانوی زبان کی حیثیت سے صرف ایک ہی پرچہ جدید اردو کے نام سے

سالِ اول میں ہی پڑھایا جاتا ہے سالِ دوم میں اردو نہیں پڑھائی جاتی ہے۔ اس طرح اس کالج میں بی.اے. اردو اور ثانوی زبان کے طلبہ کی کل تعداد ایک سو سے زیادہ ہے اور اس کالج میں راقم السطور کے علاوہ ڈاکٹر شہزادی بیگم، جناب پی.کے. ابوبکر اور کے. پی. شکیلا چار اساتذہ اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بارھویں (انٹرمیڈیٹ) میں اردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھ کر آنے والوں کے لیے جو داخلے نہیں مل رہے تھے اب ایک حد تک یہ مسئلہ حل ہوا ہے۔

دوسرا سرکاری کالج گورنمنٹ برنن کالج تلشیر ہے: اس کالج کا قیام 1890 میں ہوا اور یہ کیرالہ کے سب سے قدیم اور چار اہم کالجوں میں سے ایک ہے۔ مستقبل قریب میں اس کے خود مختار تعلیمی ادارہ بن جانے کے امکانات ہیں اور اس کا اعلان بھی ہو چکا ہے۔ اس کا الحاق کنانور یونیورسٹی کے ساتھ ہے۔ یہاں کا اردو شعبہ بھی بہت قدیم ہے۔ کئی برسوں سے یہاں دو مضمون یعنی (Double Main) کی حیثیت سے اردو زبان کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس کورس کے 8 پرچوں میں چار پرچے اردو کے اور بقیہ چار تاریخ اسلام کے ہیں جو انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ آدھے پرچے اردو کے اور آدھے تاریخ اسلام کے ہونے کی وجہ سے اس کورس کو B.A. Double Main Urdu کہا جاتا ہے۔ یہاں غیر مسلم طلبہ بھی اچھی خاصی تعداد میں اردو میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کالج میں ثانوی زبان کی حیثیت سے بھی اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ بی.اے. کے سال اول میں ایک پرچہ اور سال دوم میں دو پرچے پڑھائے جا رہے ہیں لیکن بی. کام اور بی.ایس.سی. والوں کے لیے صرف سال اول میں ہی اردو کا ایک پرچہ پڑھایا جا رہا ہے۔ اس کا نصاب کنانور یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ذریعے مرتب کیا جاتا ہے۔ اس کالج کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے اردو طلبہ کے لیے ہر کورس میں 2 فیصد کے تحفظ کا انتظام ہے۔ تقریباً ایک سو طلبہ یہاں اردو میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور دو اساتذہ اردو میں درس و تدریس کا کام انجام دے رہے ہیں جن کے نام جناب ای. محمد اور جناب پی.کے. اسمٰعیل ہیں۔

تیسرا کالج جہاں ڈگری کی سطح پر اردو تعلیم کا انتظام ہے وہ شری شنکر آچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت کالڑی کا کوئی لانڈی سینٹر ہے۔ اس سینٹر میں ایم.اے.، ایم فل اور پی. ایچ ڈی کی بھی سہولت ہے۔ اس سینٹر میں تقریباً تین برسوں سے گریجویشن کی سطح پر اردو زبان میں تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس سے قبل صرف ایم.اے. اردو کا انتظام تھا۔ یہاں اردو میں جو ڈگری کورس ہے اس کو Triple Main System یا سہ زبانی نظام کہا جاتا ہے۔ اس میں طلبہ کو تین مضامین پڑھنے پڑتے ہیں۔ جیسے اردو کے ساتھ ساتھ سنسکرت، تاریخ، فلاسفی وغیرہ بھی پڑھنے ہوں گے۔ ڈاکٹر صفیہ بی صدر شعبۂ اردو بھی ہیں اور اس سینٹر کی ڈائریکٹر بھی، ان کے علاوہ جناب کے.بی. عطاء اللہ خاں سنجری، جناب کے. یو بکلون بحیثیت اردو اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ چار جز وقتی اساتذہ بھی درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔

مذکورہ کالجوں کے علاوہ جن تین سرکاری امداد یافتہ کالجوں میں اردو صرف ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہے وہ ہیں فاروق کالج کالی کٹ، سرسید کالج تلی پرمبا، این.اے.ایم. کالج کلی کنڈی۔

فاروق کالج: کیرالہ کے سرکاری امداد یافتہ نجی کالجوں میں فاروق کالج سب سے قدیم اور مشہور کالجوں میں سے ایک ہے۔ اس کا قیام 1948 میں ہوا اور اس کا الحاق کالی کٹ یونیورسٹی کے ساتھ ہے۔ اس میں اردو صرف ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہے۔ تقریباً 60 طلبہ یہاں اردو میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ڈاکٹر ریاض احمد یہاں اردو کے استاد ہیں۔

سرسید کالج تلی پرمبا: یہ بھی سرکاری امداد یافتہ نجی کالج ہے جس کا قیام 1967 میں ہوا اور اس کا الحاق کنانور یونیورسٹی کے ساتھ ہے۔ یہاں بھی اردو بحیثیت ثانوی زبان پڑھائی جا رہی ہے۔ اس کالج میں جو اساتذہ اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ جناب محمد یعقوب شریف اور جناب عبداللہ کٹی۔ اس کالج میں تقریباً 75 طلبہ اردو پڑھ رہے ہیں۔

این.اے.ایم. کالج کلی کنڈی (ضلع کنانور): اس کالج کا قیام 1995 میں عمل میں آیا۔ اس کالج کا الحاق بھی کنانور یونیورسٹی کے ساتھ ہے۔ اس میں بھی اردو صرف ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہے۔ جناب افسر باشاہ یہاں اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

بہتر ہوگا اگر یہاں کے کالجوں میں اردو تعلیم کے سلسلے میں درپیش مسائل پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ کیرالہ کو اگر ہم تین علاقوں میں تقسیم کریں تو اس میں مالا بار ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد زیادہ ہے۔ لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ یہاں کے اردو والوں کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ مالابار علاقے میں پالگھاٹ، پٹامبی، پیرونتلمنا، ترور، کالی کٹ ٹمبلی، موکیری اور کاسرگوڑ وغیرہ سرکاری کالجوں اور منار گھاٹ، ممباڑ، یوتانی، کونڈوٹی ترورنگاڑی وغیرہ سرکاری امداد یافتہ نجی کالجوں میں اردو تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہ سب وہ کالج ہیں جہاں اردو تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اردو پڑھنے والے طلبہ مجبوراً ہندی یا دوسری زبانیں بحیثیت ثانوی زبان پڑھ رہے ہیں۔ ان کالجوں کے علاقوں میں تقریباً ہر اسکول اور اعلیٰ ثانوی اسکول میں اردو تعلیم کا انتظام ہے لیکن گریجویشن کی سطح پر کوئی انتظام نہیں ہے۔

راقم السطور کو اردو درس و تدریس کے تقریباً 20 سال کے عرصے میں جن مسائل اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ان میں سب سے اہم مسئلہ ہے جن کالجوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہے ان میں اردو طلبہ کا داخلہ نہ ملنا۔ اگر ڈگری کالجوں میں داخلہ ہی نہیں ملا تو اردو درس و تدریس کے مسائل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں یا نجی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سرکاری یا علاقائی زبان کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کیے ہوئے طلبہ پر ہر میدان میں سبقت لے جاتے

ہیں۔ متوسط اور معاشی طور پر پسماندہ خاندانوں کے بچے انگریزی میڈیم اسکولوں کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ علاقائی زبان والے یا سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اردو طلبہ کی اکثریت کا تعلق اسی طرح کے اسکولوں سے ہے۔ ایسے طلبہ جن کی تعلیم معمولی سرکاری اسکولوں میں ہوتی ہے، اچھے نمبر حاصل نہیں کر سکتے۔ اچھے نمبر نہ ہونے کی وجہ سے انھیں ڈگری کالجوں میں داخلے نہیں مل پاتے۔ اس طرح اردو پڑھنے والے طلبہ کالجوں میں داخلے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کالجوں میں اردو پڑھنے والے بچے نہیں ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کالجوں میں اردو کا داخلہ بالکل نہیں ہو پاتا ہے۔ اس مسئلے کا ایک حل یہ ہے کہ اردو ایک اقلیتی زبان ہے اس کی بقا کے لیے کالجوں میں داخلوں کے لیے کم از کم 32 فیصد کے تحفظات کا انتظام کیا جائے۔ کیرالہ کے گورنمنٹ برنن کالج میں فی الوقت یہ انتظام ہے۔ اگر کیرالہ کے دیگر کالجوں میں بھی تحفظات کا یہ انتظام کیا جائے تو اردو پڑھنے والوں کے لیے بڑی آسانیاں ہو جائیں گی۔

ایک اور مسئلہ یہاں کے کالجوں میں اردو میں تعلیم کا یہ ہے کہ اردو تعلیم کا معیار دوسری زبانوں کے مقابلے میں اتنا تشفی بخش نہیں ہے۔ یہ ایک تشویش ناک صورت حال ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً والدین کا اپنے بچوں کے تئیں احساس ذمے داری کا فقدان، ایک حد تک اساتذہ کی عدم دلچسپی، حکومت کی غیر ذمے دارانہ پالیسی، کالجوں میں سیاست کا دخل، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کے غیر اطمینان بخش نتائج کا سلسلہ تحتانوی تعلیم سے جا کر ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کی بنیاد ہی اگر کمزور اور ناقص ہو تو اعلیٰ تعلیم کا معیار کیسے بلند ہوگا۔ دوسری وجہ زبان کی باریکیوں سے بچوں کی ناواقفیت اور اساتذہ کا اپنے پسندیدہ اسباق پڑھا کر دوسرے اسباق سے سرسری طور سے گزر جانا بھی اردو تعلیم کے معیار پر برا اثر ڈالتا ہے۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بنیاد عام طور پر کمزور ہوتی ہے جسے کالج کی سطح پر آنے کے بعد اگر سنوارنا ہے تو موجودہ نصاب کافی نہیں ہے۔ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے ان کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ایسے نصاب کی ضرورت ہے جو طالب علم کی ضرورت کے علاوہ عملی افادیت کو بھی ذہن میں رکھ کر ترتیب دیا گیا ہو۔ غیر اردو علاقوں کے طلبہ کو نصابی کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ان کے لیے وظیفے کا بھی بندوبست کرنا ہوگا۔ غیر اردو علاقوں کے طلبہ برسوں پڑھنے پڑھانے کے باوجود اردو زبان بولنے اور لکھنے پر قادر نہیں ہو پاتے۔ کسی زبان کو بولنے کے لیے اس کے ماحول کا ہونا ضروری ہے جہاں اس زبان میں روزمرہ کا کام ہوتا ہو۔ میرے مشاہدے میں یہ بات بھی آئی ہے کہ غیر اردو علاقوں کے لوگ اردو ماحول کے علاقوں میں رہ کر مختصر مدت میں ہی بول چال پر پوری طرح قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ جب کہ یہی لوگ برسوں اردو پڑھنے کے باوجود اردو کا ایک جملہ بھی صحیح ڈھنگ سے بول نہیں سکتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسے لوگوں کو اردو علاقوں میں اردو کا ماحول ملتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے طلبہ کے لیے سرکاری یا غیر سرکاری ادارے جیسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ریاستی اردو اکادمیاں انجمن ترقی اردو کی علاقائی شاخیں وغیرہ سامنے آئیں اور وہ تمام اقدامات کریں جو غیر اردو علاقوں کے طلبہ کی فلاح و بہبود اور تعلیمی ترقی میں معاون ہوں۔ یعنی انھیں سال میں کم از کم ایک بار حیدرآباد، دلی، لکھنؤ، علی گڑھ جیسے ادبی مراکز کے اسفار اور وہاں کی ادبی محفلوں اور مجلسوں میں شرکت کا موقع فراہم کرائیں۔

یہاں کے کالجوں میں اردو درس و تدریس کا ایک اور اہم مسئلہ اعراب کا ہے (یعنی زیر، زبر، پیش اور جزم و تشدید کے استعمال کا مسئلہ) عام طور پر ان علامتوں یا اعراب کو اردو الفاظ کا حصہ نہیں بنایا جاتا ہے۔ صرف عربی ہی اعراب کے ساتھ لکھی جاتی ہے تاکہ زیر یا زبر کی غلطی کا امکان نہ رہے۔ غیر اردو علاقوں کے طلبہ سے یہ توقع کرنا کہ جملے میں کسی لفظ کی معنویت کا اندازہ کر کے صحیح زیر و زبر تک رسائی حاصل کرے گا یہ ایک دشوار مرحلہ ہے۔ اردو میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو ایک ہی قسم کے حروف سے تین تین چار چار الفاظ بنتے ہیں جیسے مُلک مَلک ۔مِلک وغیرہ۔ جملے میں ان کے استعمال کا موقع و محل دیکھ کر صحیح لفظ کو پہچانا جا سکتا ہے مگر غیر اردو علاقوں کے طلبہ کے لیے یہ وقت طلب ہوگا کیوں کہ اس طرح کے الفاظ میں جہاں کئی طرح کی صورتیں بنتی ہیں اور غلطی کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے کم از کم درسی کتب میں ایسے مشتبہ الفاظ پر اعراب کا اہتمام کیا جانا ضروری ہے اور ایسے الفاظ کو منتخب کر کے ایک کتاب کی شکل میں شائع کرنا بھی بے حد ضروری ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم مسئلہ قواعد کا ہے۔ اب تک قواعد کی جو کتابیں یہاں کے نصاب میں شامل کر کے پڑھائی جا رہی ہیں وہ ناکافی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے طالب علم پوری طرح قواعد سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتے۔ دستیاب قواعد کی کتابیں پڑھنے سے خاص طور پر جملے کی ساخت میں فعل، فاعل اور مفعول کا مقام "نے" "کو" کا استعمال، اضافت "کا کے کی" وغیرہ کا استعمال، مذکر مونث، واحد اور جمع وغیرہ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے خاص طور پر غیر اردو علاقوں کے طلبہ کے لیے ان کے ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے قواعد کی کتاب مرتب کرنا ضروری ہے۔

غیر اردو علاقوں کے اردو طلبہ کا نصاب مادری زبان والے طلبہ کے نصاب سے مختلف ہونا فطری طور پر ضروری ہے۔ کیوں کہ دیگر زبان کی تعلیم کی نفسیات مادری زبان کی تعلیم کی نفسیات سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ طلبہ کی مادری زبان اور سیکھی جانے والی زبان کے درمیان صوتی و نحوی مطالعے، تقابلی انداز پر نصابی کتاب کے مولف اور مدرس کے ذہن نشیں ہونا ضروری ہیں تاکہ وقت ضرورت وہ مادری زبان اور دیگر زبانوں کے معانی و مطالب کو سمجھ سکیں۔ اسی طرح صحیح تلفظ ادا کرنے کے لیے بھی کوئی ایک اصول یا قاعدہ موجود نہیں ہے۔ اردو ماحول والوں کے لیے یا مادری زبان اردو والوں کے لیے ایک حد تک یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے کیوں کہ الفاظ کا صحیح تلفظ یا ش ق سننے یا بولنے کے وہ عادی ہیں۔ لیکن غیر اردو علاقوں کے طلبہ کے لیے یہ ایک بہت بڑا

مسئلہ ہے۔ اس لیے ایسے طلبہ کے لیے تلفظ کے کچھ اصول یا قاعدے بنائے جائیں یا ایک کتاب ترتیب دی جائے۔ مثلاً۔ فضا بعض لوگ بولتے ہیں تو بعض لوگ فضا بولتے ہیں۔ اسی طرح دماغ، چراغ، سر، اسلوب، سفید مسلسل وغیرہ۔ ایسے بے شمار الفاظ ہیں جن کا صحیح تلفظ معلوم نہیں ہوتا۔

اردو کی بنیاد ابتدائی تا ثانوی سطح کا نظام تعلیم ہے۔ مذکورہ تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو زبان سیکھنے کے لیے درسی کتابیں تیار کرنا اور اردو سکھانے والے اساتذہ کو اردو تہذیب وتمدن اور معاشرے سے واقف کرانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر زبان کی مزاج شناسی مشکل ہے۔ تعلیمی مواد پیش کرتے وقت اصلاحات مفردات وتعبیرات اور لغوی تراکیب کے ساتھ ساتھ صحت نطق اور صوتیاتی نظام پر توجہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ مخارج حروف کی صحت کا کام مستقل طور پر ہماری بے توجہی کا شکار ہے۔ ہمیں بحیثیت معلم روز اول ہی سے اس پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ صوتیاتی تجربہ گاہ کے تجربات بتاتے ہیں کہ عام انسان کو کسی دوسری زبان کا لفظ شروع شروع میں اس کی اپنی مادری زبان ہی کے سمعی نظام کے پردے اور اس کی گونج میں سنائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی لفظ مختلف لغوی ماحول کے مختلف سامعین کو مختلف سنائی دیتا ہے۔ لہٰذا تعلیم سمعی بصری وسائل کی مدد سے لسانی تجربہ گاہ (Language Laboratory) میں ہونی ضروری ہے تاکہ کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ لغوی مہارت حاصل ہو سکے۔ راست طریقے پر کسی دوسری زبان کی مدد کے بغیر غیر مادری زبان سیکھنا کئی حیثیتوں سے اچھا اور بہتر ہوتا ہے۔

ان تمام اقدامات کے لیے محض کاغذی کاروائیوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اس کے لیے صدق دل سے مثبت اور پوری تندہی سے عملی طور پر کام کرنا ہوگا۔ یہ سارے کام پسماندہ طبقے کے لوگ نہیں کر سکتے۔ قومی اردو کونسل جیسے ادارے سروے کرائیں اور جہاں جس چیز کی ضرورت ہے وہ مہیا کرائیں ایسا کرنے سے ہی ہم اردو درس وتدریس کے مسائل ایک حد تک حل کر سکتے ہیں۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میرے کالج میں تقریباً 9 ڈگری کورس ہیں جن میں اردو بھی شامل ہے۔ یہاں ایک ایک مضمون کے لیے ایک ایک ڈگری کورس ہوتا ہے۔ جب ان کورسوں میں داخلوں کے لیے درخواستیں وصول ہوتی ہیں تو اردو کے طالب علم بھی درخواست میں پہلی اور دوسری پسند دوسرے مضامین کو دے کر اردو کو تیسری پسند کے طور پر درخواست "پُر" کرتے ہیں۔ اردو ڈگری کورس کو پہلی پسند لکھ کر داخلہ لینے والے طلبہ بہت کم ہوتے ہیں۔ جن طلبہ کو دوسرے ڈگری کورسوں میں داخلے نہیں ملتے مجبوراً اردو ڈگری کورس میں داخل ہوتے ہیں۔ مجبوراً اردو میں داخل ہونے والے اردو پڑھنے میں اتنی دلچسپی اور توجہ نہیں دکھاتے جتنی کہ پہلی پسند والے طلبہ دکھاتے ہیں۔ ایسے طلبہ سب کے لیے دردسر ہوتے ہیں۔ وہ صرف وقت گزاری کے لیے یا سیاست میں قسمت آزمائی کے لیے اردو ڈگری کورس میں داخلہ لیتے ہیں۔ ایسے طلبہ کے داخلوں کو ہم روک نہیں سکتے۔ اس لیے ایسے طلبہ کے داخلوں کو رد کرنے کے لیے کچھ اقدامات اٹھانا ضروری ہیں۔

غیر اردو علاقے کے اردو طلبہ کے لیے اردو ڈگری کورس میں ترجمہ نگاری کا ایک پرچہ نصاب میں شامل کرنا بے حد ضروری ہے۔ تاکہ اردو سے علاقائی زبان اور علاقائی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنے میں آسانی ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اردو میں فن ترجمہ نگاری پر یا اس کے اصولوں پر اب تک نہ کوئی مستند کتاب ہے اور نہ ہی اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کوئی مناسب انتظام ہے جن سے تعلیم یافتہ نوجوان خود آگے چل کر کوئی راہ نکال سکیں۔ لہٰذا اس پر توجہ کرنا اور مذکورہ موضوع پر کتابیں مہیا کرنا ضروری ہے۔

ایک اور مسئلہ جو آج کل غیر اردو طلبہ کو ہی نہیں بلکہ مادری زبان اردو والے طلبہ کو بھی درپیش ہے وہ یہ ہے کہ اردو مادری زبان والوں کو ہی اردو میں ڈگری کورس کرنا پسند نہیں ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غیر اردو علاقوں کے لوگ اردو میں تعلیم کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ عصر حاضر میں ہر چیز نفع ونقصان کے میزان پر رکھ کر تولی جا رہی ہے۔ اس لیے سب لوگ اس اندیشے میں مبتلا ہیں کہ ہمارے بچے اردو میں تعلیم حاصل کر کے روزگار اور کاروبار کے میدان میں دوسروں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ ایسی حالت میں اگر غیر اردو علاقوں کے بچے جب اردو میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ مقصد دل میں رکھ کر ہی کالجوں میں اردو پڑھنے کے لیے اردو ڈگری کورس میں داخلے لیتے ہوں گے۔ لیکن جب ان کو روزگار کی کمی اور کہیں کہیں روزگار کا فقدان وغیرہ کا احساس ہوتا ہے تو ان میں بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم ویسے تو ڈگریاں مہیا کرا دیتی ہے لیکن روزگار کے مواقع یا اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت نہ ہونے کی صورت میں طلبہ مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس لیے وہ کالجوں میں تو داخلے لے لیتے ہیں لیکن پڑھنے میں دلچسپی نہیں دکھاتے۔ اس لیے اردو اعلیٰ تعلیم کو روزگار سے جوڑنا بے حد ضروری ہے۔ یا حکومت کی طرف سے کچھ امداد دلانا ضروری ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر میدان میں انگریزی کی بالادستی ہے۔ اس لیے اردو والوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ اردو تعلیمی نظام بالخصوص اعلیٰ تعلیم میں انگریزی کو بھی شامل کرنا ضروری ہوگا۔

چنانچہ اردو ذریعۂ تعلیم سے پڑھنے والے غیر اردو طلبہ جو اعلیٰ تعلیم یا پیشہ ورانہ کورس کے میدان میں داخل ہوتے ہیں تو انگریزی میں کمزور استعداد کے باعث ناکامی اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں انھیں اس صورت حال سے بچانے اور اس کے تدارک کے لیے اردو ذریعۂ تعلیم کے اداروں میں انگریزی کی کوچنگ کا انتظام کرنا ہوگا۔ صحافت اور ترجمہ نگاری کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کو بھی اردو کی اعلیٰ تعلیم کا حصہ بنانا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی طلبہ اردو ذریعۂ تعلیم کی طرف راغب ہوں گے اور اردو کی اعلیٰ ڈگریاں بامعنی ثابت ہو سکیں گی۔

□□□

Head Deptt. of Urdu
Govt. College, Malappuram , Kerala-676509

مزمل حسین قاسمی

کمپیوٹر کی مدد سے تدریس

کمپیوٹر کی مدد سے تدریس اس حالت کو کہتے ہیں جب طالب علم کمپیوٹر کے ذریعے ٹرمنل کے ساتھ دوطرفہ تفاعل میں مشغول ہوتا ہے۔ اس عمل میں کمپیوٹر کا استعمال کر کے نصاب کے کسی بھی حصے کو پڑھایا سکھایا جاسکتا ہے۔ اس طریقۂ تدریس میں کمپیوٹر کا رول اشیائے امدادی کی طرح ہوتا ہے۔

تدریس میں کمپیوٹر کا استعمال:

بار کر پی (1988) نے تعلیم میں کمپیوٹر کے استعمال کو درج ذیل کاموں کے لیے مفید بتایا ہے۔

1. آموزش کا انتظام (Management of Learning)
2. جانچ (Testing)
3. اتالیق کے لیے (Tutoring)
4. مشق کے لیے (Exercising)
5. حساب جوڑنے کے لیے (Use of Computer as a calculator)
6. تجربہ گاہ کی طرح کمپیوٹر کا استعمال (Use of Computer as a Laboratory)
7. تکنیکی مواد پیدا کرنے کے لیے کمپیوٹر کا استعمال (Use of Computer for producing technical material)
8. مواد کی نشر و اشاعت (Dissemination of material)
9. مواد کی حفاظت (Archival of material)
10. اظہار کا ذریعہ (Medium of expression)

کمپیوٹر کی مدد سے تدریس کے مختلف طریقے

اگرچہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر انواع و اقسام کی کارکردگی پر مشتمل ہے۔ لیکن تعلیمی مواد کو پیش کرنے میں زیادہ تر درج ذیل اندازوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

1. تکثیر یا ڈرل اور مشق (Drill and Practice)
2. نجی تعلیم (Tutorial)
3. مکالمہ/گفتگو (Dialogue/Conversation)
4. بیان/پیش کش (Narration/Presentation)
5. تمثیل (Simulation)
6. اعداد و شمار کی ذخیرہ اندوزی (Databases)
7. کھیل کا طریقہ (Gaming)

1. ڈرل اور مشق:

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی سب سے آسان شکل ڈرل اور مشق ہے جس میں کمپیوٹر کے ذریعہ مشقوں کا ایک سلسلہ طلبہ کو پیش کیا جاتا ہے اور طلبہ اسے کمپیوٹر پر حل کرتے ہیں۔ طلبہ کے جوابات بھی کمپیوٹر کے ذریعے جانچے اور پرکھے جاتے ہیں۔ پھر طلبہ کے جوابات کی روشنی میں استاد نئی مشق کے لیے سوالات تیار کرتا ہے۔ کمپیوٹر ایک مشق کو بار بار نہیں دہراتا۔ کمپیوٹر کی یادداشت میں بہت سارے مشقیہ سوالات پہلے سے بھر دیے جاتے ہیں اور کمپیوٹر فہرست سے ان سوالات کا انتخاب بغیر کسی ترتیب کے (randomly) کرتا ہے اور انھیں اسکرین پر طلبہ کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی سلسلے کی نئی مشق بھی ہوتی ہے جس میں مواد کی کڑیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں۔ اس طرح کمپیوٹر کے ذریعے لامتناہی مشقی سوالات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مشقوں کی منصوبہ بندی اس طرح کی جاتی ہے کہ طلبہ کا جواب صحیح ہونے پر صحیح کا نشان اسکرین پر آجاتا ہے اور اگر غلط ہے تو ''دوبارہ کوشش کیجیے'' (Try again) کا اشارہ اسکرین پر آتا ہے یا صحیح جواب کی طرف علامتی اشارہ کر دیا جاتا ہے یا صحیح جواب ہی اسکرین پر آجاتا ہے۔ اس طریق کار میں طلبہ کے جوابات کا بھی تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ پروگرام کی کامیابی کا اندازہ لگایا جاسکے اور مزید ترمیمات کی جاسکیں۔

ڈرل اور مشق میں درج ذیل اقسام کی مشقیں ہوتی ہیں:

(الف) مختصر ترین سوالات

1. خالی جگہوں کو بھرو
2. صحیح یا غلط پر نشان لگاؤ
3. ایک لفظ یا ایک جملے میں جواب دو
4. کثیر انتخابی سوالات (Multiple choice questions)
5. گروپ سے کون مختلف ہے؟ (Odd man out)

(ب) مختصر جواب والے یعنی ایسے سوالات جن کا جواب ایک یا دو جملوں میں ممکن ہو۔ عموماً ایسے لمبے سوالات کو پوچھنے سے گریز کیا جاتا ہے جن کے جوابات میں زیادہ ٹائپ کرنے کی ضرورت ہو۔

(ج) عملی کام جیسے خاکہ بنانا، خط کشید کرنا، دیے ہوئے متن میں اہم حصوں کے نیچے لائنیں کھینچنا، لائن گراف، بار گراف، ہسٹوگرام، پائی ڈائیگرام، فلوڈائیگرام، وغیرہ بنانا، ناپ تول کرنا اور چیزوں کو ان کی خصوصیات کے مطابق درجہ بند کرنا کمپیوٹر کے عملی کاموں میں ممکن ہے۔

II. نجی تعلیم یا ٹیوٹوریل:

ٹیوٹوریل میں زیر مطالعہ مضمون کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں جسے فریم کہا جاتا ہے۔ ان فریموں کو کمپیوٹر کے ذریعے سلسلہ وار پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تدریسی پروگرام پہلی نظر میں اس پروگرام شدہ تدریس کے مشابہ نظر آتا ہے جسے 1960 کی دہائی میں تدریسی مشین کے لیے ترویج کیا گیا تھا۔ لیکن ٹیوٹوریل میں متن کی پروگرامنگ بیک وقت کئی مسائل کو پیش کرنے کے لیے کی جاسکتی ہے۔ خاص طور پر اس بات کی توثیق بھی کی جاتی ہے کہ طالب علم نے موجودہ قدم پر اتنی مہارت حاصل کرلی ہے کہ وہ اب دوسرے قدم کی فروعات نکال سکتا ہے۔ طلبہ کی ضرورت، ان کی ترجیحات کا تعین اور مواد سے مزید برانچ نکالنے کے لیے کمپیوٹر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں طلبہ پر بوجھ بڑھائے بغیر مواد کو مزید پیچیدہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح یہ طریقہ برانچنگ کے میدان میں مزید برانچ کھولنے کے امکانات پیدا کرتا ہے۔ جو عام طور پر پرانی تدریسی مشین میں ممکن نہیں ہوتا۔ متن کے کئی متبادل صفحات کو برانچ کرنے کے لیے کمپیوٹر میں پروگرام بنائے جاسکتے ہیں جس کے کئی راستے ہوسکتے ہیں۔ ٹیوٹوریل میں ہر طالب علم کی تشخیص چھوٹی سے چھوٹی سطح پر کی جاسکتی ہے اور اس کی ضرورتوں کے مطابق اسے نئے راستے پر گامزن کیا جاسکتا ہے۔

III. گفتگو/ مکالمہ:

آج کمپیوٹر میں یہ بھی سہولت ہے کہ استاد اور طالب علم ڈائیلاگ باکس کھول سکتے ہیں۔ یہ طریقۂ تعلیم سقراط کے ذریعے استعمال کیے گئے سیکھنے سکھانے کے طریقے پر مبنی ہے۔ اس میں استاد اور طالب علم دونوں ہی سکھانے کا طریقہ شروع کردیتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ اس طرح کے مکالماتی ٹیوٹوریل تدریسی تعلیمی ماڈل کے اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں جس میں پیچیدہ اور فروعاتی پروگرامنگ ہوتی ہے جس میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ اسی لیے اس طرح کے مکالماتی پروگراموں کا لکھنا تحقیقی تجربہ گاہ کا کام ہوتا ہے اور اس لیے یہ وسیع پیمانے پر استعمال نہیں کیا جاسکتا، مثلاً ماحولیاتی پراگندگی پر یہ مکالمہ:

استاد : ماحولیاتی پراگندگی کسے کہتے ہیں؟
طالب علم : ماحول کیا ہوتا ہے؟
استاد : آپ کے گردوپیش کی چیزیں آپ کا ماحول ہے۔
طالب علم : کیا پراگندگی اور گندگی ایک ہی چیز ہے؟
استاد : دونوں مترادف الفاظ ہیں۔
طالب علم : گردوپیش کی گندگی کو ماحولیاتی پراگندگی کہتے ہیں۔

اس چھوٹے سے مکالمے میں ماحولیاتی پراگندگی کے کئی برانچ فریم بن سکتے ہیں۔ طالب علم ہر خط کشیدہ لفظ پر کلک کرے گا تو اسے الگ الگ فریم میں ان تصورات سے متعلق معلومات مل سکتی ہیں۔

مکالماتی ٹیوٹوریل کے دوران کمپیوٹر طالب علم کے بارے میں تجزیہ کرنے میں مشغول رہتا ہے۔ اور اس سے حاصل شدہ اعداد و شمار کا تجزیہ کرکے استاد (کمپیوٹر پروگرامر) اپنے آپ کو سدھارتے رہتے ہیں اور تدریسی حکمت عملی کو مزید انفرادیت کا جامہ پہناتے رہتے ہیں۔ اس طریقہ کے تحت سوال در سوال اور کثیر تجزیاتی تکنیک کا استعمال کرکے پیچیدہ اور فروعاتی تفاعلی مکالمات تیار کیے جاسکتے ہیں۔

اس طریقے کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ خرچ کے لحاظ سے موثر (Cost effective) نہیں ہے۔ مکالمات کو لکھنے اور اس سے متعلق چھوٹے چھوٹے مواد کو فریم کرنے میں استاد کو تحقیق کرنی ہوتی ہے اور وقت زیادہ لگتا ہے۔

IV. تمثیل

حقیقی زندگی کے کچھ نظام اور پہلوؤں کو براہ راست نہیں سیکھا جاسکتا ہے۔ ان براہ راست تجربات میں وقت زیادہ لگتا ہے۔ صرفہ زیادہ ہوتا ہے۔ کئی مرتبہ انھیں حاصل کرنا مشکل بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی خطرناک بھی۔ ان پہلوؤں کو کمپیوٹر کے ذریعہ تمثیلی شکل میں آسانی سے پیش کیا جاسکتا ہے۔

تمثیل کے لیے وضع کردہ اصول آسان بھی ہوسکتے ہیں اور پیچیدہ بھی اور مشابہت اور قربت کی کوالٹی پر بھی کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ ایک ہی تمثیلی کورس میں مختلف سطح پر مشابہت کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ تمثیل کی صحت کے لیے پروگرامر (استاد) تجرباتی غلطیوں کے اثرات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسری تمثیلات میں ترمیمات کرکے اسے عملی مشق کے زیادہ قریب کردیتا ہے۔

کمپیوٹر کے ذریعہ تمثیل کے درج ذیل فائدے ہیں:

1. مثالی حالات کا استعمال کرکے مشکلات اور پیچیدگیوں سے بچ سکتے ہیں مثلاً چیزوں کی مانگ اور سپلائی میں تبدیلی کو بازار کی معیشت پر اثر اندازی کی شکل میں ایک ساتھ دکھایا جاسکتا ہے۔
2. تمثیل کے ذریعہ تجربہ گاہ اور فیلڈ ورک کے تجربات پر آنے والے بھاری اخراجات سے بچا جاسکتا ہے جیسے مختلف کثافت والے تیزابوں کو ایک تجربہ میں دکھایا جاسکتا ہے جو لیباریٹری میں ممکن نہیں یا ندی گھاٹی کے مختلف ادوار میں ہموار کاری کے عمل کو بیک وقت دکھایا جاسکتا ہے۔
3. عام طور پر تجربہ کے لیے درکار وقت کو کم کیا جاسکتا ہے۔
4. خطرناک تجربات کو بہ حفاظت پیش کیا جاسکتا ہے جیسے نیوکلیائی دھماکہ،

ماحول میں بڑھتی ہوئی آلودگی اور اس کے نتائج، پیڑ پودوں، جانوروں اور انسانوں پر پڑنے والے اثرات۔

5. عام طور پر غیر عملی تجربات کو بھی کمپیوٹر پر تمثیل کے ذریعہ پیش کیا جاسکتا جیسے ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک کا تہذیبی اور ثقافتی ارتقا۔

6. کمپیوٹر کے ذریعہ تمثیل میں پیچیدگی کی سطح کو طلبہ کی صلاحیت کے مطابق رفتہ رفتہ بڑھایا گھٹایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہر سطح پر متغیرات (Variables) میں اضافہ یا کمی کرنا ممکن ہے۔

V. بیان/ پیش کش:

طلبہ کو علمی مواد پیش کرنے کے لیے کمپیوٹر اسکرین کو تختۂ سیاہ کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہم اسے الیکٹرونک بلیک بورڈ کا نام دے سکتے ہیں۔ جس پر بیان اور تشریح کے نکات آسانی سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس پر عام تقریری اور تحریری طریقوں کے علاوہ چلتی پھرتی تصویروں، ہیولوں (animation)، خاکوں اور متحرک الفاظ کا استعمال مختلف دلکش رنگوں اور موسیقی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ طلبہ کو نئے علمی مواد سے متعارف کرانے کے لیے اساتذہ آسان پیش کش بہ آسانی تیار کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اساتذہ ایم ایس پاور پوائنٹ کو استعمال کر کے سلائڈ شو تیار کرسکتے ہیں۔ اسی طرح فرنٹ پیج کا استعمال کر کے ویب پیج تیار کرسکتے ہیں۔ ایم ایس ایکسل کا استعمال کر کے مختلف قسم کے آنکڑوں کو پیش کرسکتے ہیں۔

VI. اعداد وشمار کی ذخیرہ اندوزی یا ڈاٹا بیس

سیکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ علمی مواد کے مختلف وسائل کی تلاش کی جائے اور لائبریری کھنگال کر علم حاصل کیا جائے۔ کمپیوٹر میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مختلف قسم کے مضامین کے آنکڑوں کی ذخیرہ اندوزی کر کے اسے بعینہ سامنے لاسکے یا ان میں من چاہی ترکیبوں/ترمیموں کا استعمال کر کے طلبہ کے سامنے پیش کردے تاکہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق مواد کو تلاش کرسکیں اور اپنے مقصد کی حصولیابی کے لیے استعمال کرسکیں۔ کمپیوٹر میں اعداد وشمار کی ذخیرہ اندوزی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب علم پوچھے گئے سوال کا جواب دے سکتا ہے، مواد سے متعلق مزید معلومات حاصل کرسکتا ہے اور ضروری مواد کی تلاش کے بعد اسے سنبھال کر رکھ سکتا ہے۔ وہ عددی اعداد وشمار کو اختصار سے پیش کرسکتا ہے اور اپنی دلچسپی کے مطابق مزید تفتیش کے لیے ممکنہ وقت کا تعین کرسکتا ہے۔

اسی طرح لائبریری میں مضمون کے کوڈ، مصنف کا انڈیکس یا ٹائٹل انڈیکس کا استعمال کر کے کسی کتاب یا مواد کے وسائل تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ استاد یا پروگرامر کی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ موادی وسائل کی دستیابی کے لیے اس طرح کی کلیدی معلومات بھی فراہم کریں۔ کمپیوٹر کے اصل فریم میں فراہم کردہ مواد بیک وقت تمام ٹرمینل پر دستیاب ہوتے ہیں جس سے ایک ہی وقت میں بہت سے طلبہ انفرادی طور پر مستفید ہوسکتے ہیں۔ یہ سہولت کتابوں میں میسر نہیں ہے۔

VII. کھیل کا طریقہ:

اب تک تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے جن طریقوں کا تذکرہ ہوا ان میں معلومات مصنف کے وضع کردہ اصولوں کے تحت ساخت کی ہوئی صورت (Structrured way) میں دستیاب ہوتی ہے۔ کمپیوٹر پر کھیل کا طریقہ سیکھنے والوں کو اپنی طرف الگ طرح سے کھینچتا ہے۔ اس میں سیکھنے والے کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور کھیل کھیل میں علمی تصورات کی مشق کرادی جاتی ہے۔ آج کل سائبر کیفوں میں ویڈیو گیم اور کمپیوٹر گیم کافی مقبول ہیں اور بچے انھیں کھیلنے میں کافی وقت ضائع کرتے ہیں۔ اگر انھیں تعلیمی کھیل مہیا کرائے جائیں تو ان کے ذریعہ یقیناً انھیں نئے تصورات اور مہارتوں سے آسانی سے روشناس کرایا جاسکتا ہے۔ جیسے موٹر ریس کے ساتھ ڈرائیونگ کے اصول، ٹریفک کے اصول، ان اصول وقوانین کی پابندی، پابندی نہ کرنے پر جرمانہ، کس غلطی پر کتنا جرمانہ، ریس کا اسکور، ریس کے اسکور میں جمع اور تفریق کا تصور، ریس کے اصول، حادثہ سے بچنے کا طریقہ، حادثہ کی صورت میں ابتدائی طبی امداد وغیرہ کو اس کھیل کے ساتھ آسانی سے جوڑا جاسکتا ہے۔

کمپیوٹر کی مدد سے تدریس کی تیاری کے اقدامات

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی تیاری کے مختلف مدارج اور ان میں اٹھائے گئے اقدامات تدریسی مواد اور مسئلے کی نوعیت کے مطابق الگ الگ ہوسکتے ہیں۔ پھر بھی مجموعی طور پر پیکیج کی تیاری میں درج ذیل پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

1. تجزیاتی مرحلہ (Analysis Phase)
2. ڈیزائن مرحلہ (Design Phase)
3. پروگرامنگ مرحلہ (Programming Phase)
4. توثیقی مرحلہ (Validation Phase)

الف. تجزیاتی مرحلہ

I. تدریسی اکائی کا انتخاب

کمپیوٹر سب سے زیادہ موثر میڈیا ہے اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے مقابلے میں مہنگا بھی ہے۔ اس لیے اس کا استعمال تخلیقی اور مشکل کاموں کے لیے منصفانہ طور پر کرنا چاہیے۔ کسی تدریسی اکائی کے انتخاب کے بعد جب استاد تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے لیے پروگرام تیار کرنے کا فیصلہ کرلے تو سب سے پہلے غور کرنا چاہیے کہ کمپیوٹر کا طریقہ ہی کیوں؟ اسے تدریس بہ امداد کمپیوٹر

کا پیکیج تیار کرنے سے پہلے درج ذیل سوالات پر غور کرنا چاہیے۔

☆ کیا میرے طلبہ دوسرے ذرائع ابلاغ یا دیگر تخلیقی طریقوں کا استعمال کرکے اس سے زیادہ سیکھ سکتے ہیں؟

☆ کیا میرے موضوع کا مقصد ایسا ہے جو صرف تدریس بہ امداد کمپیوٹر سے ہی پورا کیا جاسکتا ہے؟

☆ کیا اس میں استعمال کرنے والے کا کنٹرول ہے یا خود جانچنے کا طریقہ (Self-evaluation method) ہے؟

اگر استاد کے پاس ان سوالوں کا تسلی بخش جواب ہے تو تدریسی اکائی کا انتخاب کرے اور اگلے قدم پر منتخب اکائی کے مواد کا تجزیہ کرے۔

II. مواد کا تجزیہ

تدریسی پیکیج کو ایک خود آموزشی پروگرام بنانے کے لیے مواد کا مناسب تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ استاد کو موضوع کے ہر نکتے کی پہچان کرنی پڑتی ہے۔ موضوع کو ذیلی عنوانات یا ذیلی نکات میں تقسیم کرنے کے طریقے کو مواد کا تجزیہ کہا جاتا ہے۔ مواد کا تجزیہ استاد کو سبق سے متعلق تمام تصورات، تعریفات، معلوماتی نکات، اصول، فارمولے، مثال، خاکے، گراف وغیرہ کی پہچان کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اس تجزیے کے ساتھ اسے یہ بھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس مواد کو خطی پروگرام میں رکھنا ہے اور کتنے مواد کو برانچ پروگرامنگ میں ڈالنا ہے تاکہ طلبہ بوقت ضرورت برانچ کو براؤز کرکے حوالہ جاتی مواد کا بھی مطالعہ کرسکیں۔

III. داخلہ برتاؤ کا تجزیہ

پروگرامر یا استاد کے لیے نشانہ گروپ کا تجزیہ بہت ضروری ہے۔ کسی بھی تعلیمی سوفٹ ویئر کو تیار کرنے سے پہلے استاد کو طلبہ کے ماقبل کا تجزیہ کرلینا چاہیے۔ اس سلسلے میں طلبہ کے پاس موجود الفاظ کا خزانہ، ان کی تعلیمی اور تفہیمی سطح، ان کے سیکھنے کا انداز اور ان کی ضرورت کا تجزیہ ضرور کرلینا چاہیے۔ مواد اور ٹارگیٹ گروپ کا تجزیہ کرلینے کے بعد استاد تصورات کے سلسلے کو منطقی طور پر ترتیب دے سکتا ہے۔ یہاں موضوع کو سیکھنے کے لیے ماقبل ضروریات کی پہچان کرنا استاد کی ذمے داری ہوتی ہے۔ اگر طلبہ بنیادی تصورات سے واقف نہیں ہیں تو آپ کے موضوع کے مواد کو نہیں سیکھ پائیں گے۔ اس لیے طلبہ کے داخلہ برتاؤ کی پوری طرح سے وضاحت ہونی چاہیے۔

IV. مقصد کی وضاحت

کسی پروگرام کے تدریسی مقاصد کا بیان بالکل ایسا ہی ہے جیسے پوری تدریسی کارروائی کو مختصر طور پر پیش کردینا۔ مقصد کی وضاحت میں مندرجۂ ذیل سوالات پوچھے جائیں۔

1. اس پروگرامنگ کے طریقۂ تدریس سے میرے طلبہ میں کون سی تبدیلیاں ہوں گی؟
2. مضامین سے متعلق طلبہ کن کن باتوں کو سیکھ پائیں گے؟
3. کمپیوٹر سے متعلق کن باتوں کو سیکھ پائیں گے؟
4. تدریس و آموزش کے کن طریقوں کو سیکھ پائیں گے؟

V. اندازۂ قدر کا تعین

مقصد کی وضاحت درحقیقت بتدریج فروغ دی جانے والی اس صلاحیت کی تشریح ہے جو ہم طلبہ میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وضاحت اندازۂ قدر کے تعین اور اس جانچ کو بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ طالب علم میں مطلوبہ صلاحیت کتنی پیدا ہوئی؟ مقصد کی واضح تحریر جانچ کو بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ طالب علم میں مطلوبہ صلاحیت کتنی پیدا ہوئی؟ ایک واضح مقصد کو تحریر میں لانے کے بعد جانچ کی فوری ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خود آموزشی مواد کا ایک تقاضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ طلبہ کی ایک ماقبل جانچ (Pre-test) کرلی جائے تاکہ استاد فیصلہ کرسکیں کہ آیا طالب علم اس مواد کو اخذ کرنے کے لائق ہیں، طلبہ کو اس مواد کی یا پیش کردہ کسی ذیلی اکائی کی ضرورت ہے یا وہ اسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ابھی تک کا تجربہ یہ ہے کہ اساتذہ خود فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کے طلبہ کو کیا سیکھنا ہے اس بات سے قطع نظر کہ طالب علم خود کیا سیکھنا چاہتا ہے یا کیا سیکھ چکا ہے۔ خود آموزشی مواد میں یہ سہولت ہوتی ہے کہ ہر طالب علم انفرادی طور پر دیکھ سکتا ہے کہ وہ کیا جان چکا ہے یا اسے کیا جاننا چاہیے۔ اسی کی بنیاد پر جانچ یا اندازۂ قدر کو فروغ دینا چاہیے۔

ب. ڈیزائن کا مرحلہ

تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں تجزیاتی مرحلے کے بعد تخلیقی مرحلہ شروع ہوتا ہے جس میں سب سے پہلے ڈیزائن تیار کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے درج ذیل اقدام ہیں۔

I. معیاری یا ماڈیول والی اکائی کی ساخت کی تشکیل

چونکہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر خود آموزش کا ایک طریقہ ہے اس لیے اس میں انفرادی فرق کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ بڑے پیمانے کے تعلیمی عمل کو چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر ایک ماڈیول والی ساخت (Modular format) کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ اس طریقے میں صاف طور پر الگ الگ بتائے گئے اجزائے علم و عمل کو طلبہ اپنی ضرورت کے مطابق سیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح ایک طالب علم اسی خاص ذیلی عنوان یا مضمون پر اپنی توجہ مرکوز کرے گا

جس میں وہ مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے معیاری ساخت کی تشکیل میں کورس ڈیزائن کرنے والے کو ہر ساخت (Modular Format) کو ایک الگ عنوان دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ مقاصد اور پیش کش کے طریقوں کو بھی بتا دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح تدریس بہ امداد کمپیوٹر کا پورا پیکیج مختلف قسم کے آپسی تعلق والے معیاری ساختوں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ گرچہ یہ ماڈیول آپس میں متصل ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرکے بھی سیکھا جاسکتا ہے۔ مناسب ماڈیول کے انتخاب میں ماقبل جانچ طلبہ کے لیے معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

II. فلو چارٹ کی تشکیل

فلو چارٹ یارواں جدول واقعات، اعمال اور تصورات کے درمیان تعلقات کی روانی کو دکھاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے بھی کاموں کے بیچ تعلقات کی روانی کی خاکائی پیش کش ہوتی ہے۔ یہ تعلقات زمانی (Temporal) یا مکانی (Spatial) یا دونوں ہو سکتے ہیں لیکن ان میں ہمیشہ ایک خاص ترتیب ہوگی۔ جب استاد ایک کورس میں استعمال ہونے والے تمام علمی مواد کو اکٹھا کرلے اور انھیں پیش کرنے کے اصول وضوابط کو وضع کرلے تو اب اسے اسکرین پر پیش کرنے کے لیے فلو چارٹ کی ضرورت ہوگی۔ یہ رواں جدول استاد کے ذریعہ تیار کردہ فریموں کے درمیان ترتیب اور تسلسل قائم رکھتا ہے۔ فلو چارٹ میں بھی فریموں کے نمبر پڑے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہائپرلنک کے جڑے لوپ فریموں کے نمبر بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح فلو چارٹ کے ذریعہ فروعی پروگراموں (Branched Programming) سے بچا جاسکتا ہے۔

III. فریم ڈیزائن

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ایک ہی عنوان کو کئی چھوٹے پیکیج میں تیار کرکے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک ماڈیول فریموں کے کئی سلسلوں پر مشتمل ہوتا ہے جیسے معیاری فریم، تدریسی فریم، جانچ فریم وغیرہ۔

(الف) معیاری فریم

معیاری فریم کو تدریسی فریم سے پہلے تیار کیا جاتا ہے جس میں تدریسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تدریسی فریموں کا معیار مقرر کیا جاتا ہے۔ اس میں طلبہ کی رہنمائی کی جاتی ہے کہ وہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے ذریعہ کس طرح اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچیں گے۔ اس فریم میں تدریسی نکات یا حوالے وغیرہ نہیں دیے جاتے۔

(ب) تدریسی فریم

تدریسی فریم میں وہ تمام معلومات مہیا کرائی جاتی ہیں جو کورس کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

(ج) جانچ فریم

جانچ فریم میں تدریسی نکات والے ہر فریم سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اسی فریم کے ساتھ تحریص یا اشاریہ کے ہائپرلنک بھی ہوتے ہیں جو غلط جواب کے درست کرنے کے لیے صحیح علمی مواد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

IV. اصل پروگرام سے متعلق اسکرین کی تیاری

اسکرین کی تیاری میں درج ذیل باتوں کا دھیان رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

1. اسکرین خاکہ

ٹرمنل اسکرین پر کیا دکھاتا ہے؟ اس سے متعلق کچھ اصول درج ذیل ہیں۔

1. ایک اسکرین سے دوسرے اسکرین تک فریم ترتیب وار ہوں۔
2. بیان کی ترتیب ایسی ہو جیسے عمل کرکے دکھایا جارہا ہو۔
3. بہت زیادہ مخفف الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔
4. اسکرین کو بہت زیادہ معلومات سے پر نہ کیا جائے۔
5. توجہ مرکوز کرنے کے لیے ٹمٹماتی روشنی (blinking) کا استعمال ہو لیکن زیادہ نہیں
6. اصل مینو (Main Menu)، جانچ، Hyperlink، Help, Quit وغیرہ کے لیے علامات ہر اسکین پر یکساں ہوں۔

2. متن

متن کا مواد بہت زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک پیراگراف دو یا تین لائنوں سے زیادہ نہ ہو۔

3. خاکے

خاکوں اور رنگوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ بہت زیادہ ٹھوس خاکوں کا استعمال یا غیر ضروری رنگوں کا استعمال سبق کو غیر دلچسپ بنا دیتا ہے۔ پس منظر میں ایک رنگ کا استعمال زیادہ بہتر ہے۔ لال اور نیلے یا سفید اور پیلے رنگ کی ملاوٹ سے گریز کرنا چاہیے۔

4. متحرک ہیولے

متحرک ہیولے اور تصویریں توجہ کھینچتی ہیں لیکن ان کا غیر ضروری استعمال بھی سبق میں عدم دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ پروگرام میں خاص خیال رہے کہ یہ ہیولے استعمال کنندہ کے کنٹرول میں رہیں تاکہ وہ جب چاہیں انھیں بند کردیں۔

5. آواز

آواز کا استعمال الفاظ کے مخارج اور سننے کی مہارت پیدا کرتا ہے۔ غلط جواب کے لیے گھنٹی کا استعمال مفید ہے۔ لیکن تحریری متن کو آواز میں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آواز کا زیادہ استعمال طالب علم کو اصل مقصد سے دور بھی کرسکتا ہے۔

6. وقت

تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں وقت کی موافقت پر خاص زور دیا جاتا ہے تاکہ طالب علم ایک خاص وقفے میں ایک خاص رفتار سے سیکھنے کا کام پورا کرسکے۔ پروگرام کی تیز رفتار یا اسکرین کے جلدی جلدی بدلنے سے طلبہ مواد اخذ نہیں کرپاتے ہیں۔ اسی طرح سست رفتاری یا اسکرین پر ایک ہی مواد کے زیادہ دیر تک رہنے سے طلبہ دلچسپی کھو بیٹھتے ہیں اور اکتانے لگتے ہیں۔

7. استعمال کنندہ کنٹرول

طلبہ پر مرکوز طریقۂ تعلیم میں باہم تفاعل (Interactivity) کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر فریم اور ہر مرحلے پر طلبہ کی تقویت رسانی ضروری ہے۔ اس لیے اسکرین پر استعمال کنندہ کا کنٹرول ہونا چاہیے۔ یہ سہولت تدریس باامداد کمپیوٹر میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ پروگرامر یا استاد کو یہ سہولت ہر فریم، ہر تدریسی نکتے، سوالات، جوابات، حوالہ جات وغیرہ پر دینا چاہیے تاکہ طلبہ کو ہر قدم پر باز افزائش مل سکے۔

ج۔ پروگرامنگ مرحلہ

پروگرامنگ مرحلے میں درج ذیل عناصر کی پروگرامنگ کرنی پڑتی ہے۔ استاد کو کسی ماہر پروگرامر سے مشورہ بھی کرلینا چاہیے۔

1. متن اور سوالات کی اسکرین پر پیش کش
(Presenting text and questions on a screen)
2. کی بورڈ کے استعمال سے جوابات کی قبولیت
(Accepting responses entered by using a keyboard)
3. جوابات کا تجزیہ
(Analysing responses)
4. ایک فائل میں جوابات اور ان کے نمبروں کی ذخیرہ اندوزی
(Storing details of responses and values of Counters on a file)
5. تعلیمی پروگرام کے دیگر فروعاتی حصے بنانا
(Branching of other parts of learning programmes)
6. باز افزائش مہیا کرنا
(Providing feedback)
7. کمپیوٹر پروگرام کی زبان سے ہم آہنگی
(Interface with computer programming language)

د۔ توثیقی مرحلہ

توثیقی مرحلے پر متن، متن اور پروگرام کی صحت، پیش کش، اعداد وشمار وغیرہ کی توثیق ماہرین کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ اس کے لیے درج ذیل اقدام ہیں۔

1. ماہرین کے ذریعہ جانچ (Evaluation by Experts)
2. ماقبل جانچ اور مابعد جانچ (Pre Test and Post Test)
3. پائلٹ مطالعہ (Pilot Study)

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے فوائد:

کمپیوٹر کے ذریعہ سیکھنے سکھانے کے عمل میں کئی طرح سے تقویت رسانی کی جاسکتی ہے۔ اس کے کچھ اہم فوائد درج ذیل ہیں۔

1. تدریس بہ امداد کمپیوٹر ایک انفرادی نظام تدریس ہے۔ اس میں ہر طالب علم اپنے حساب سے کام کرنے میں خود مختار ہوتا ہے۔ دوسرے طلبہ کی کارکردگی سے کوئی طالب علم متاثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ایک ایسا تدریسی طریقہ ہے جو خود کی رہنمائی میں مطالعے کے اصول پر مرتب کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ ہر مشکل سطح پر مقاصد کے حصول میں یا مہارتوں کے فروغ میں معاون ہوتا ہے۔
2. معلومات کو ساخت کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ان مضامین کے مطالعے میں زیادہ مفید ہے جن کے حقائق یا اصولوں میں مدارج (hierarchy) پائے جاتے ہیں۔
3. تدریس بہ امداد کمپیوٹر طلبہ کو فعال اشتراک (participation) کے لیے مجبور کردیتا ہے۔ اس کے برخلاف کتاب پڑھنے یا لیکچر سننے میں ان کا رول انفعالی اور جامد (passive) ہوتا ہے۔
4. طلبہ کی تفاعلی اشتراک کے نتیجے میں کمپیوٹر فوری باز افزائش (فیڈ بیک) فراہم کرتا ہے۔ یہ فیڈ بیک اصلاحی قسم کی ہوسکتی ہے یا کمپیوٹر طلبہ کے جوابات کے مطابق مختلف طریقوں/مختلف مواد کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے۔
5. تدریس بہ امداد کمپیوٹر رپورٹنگ سسٹم کا استعمال کرتی ہے۔ جو طلبہ کی ترقی کی واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ اس طرح طلبہ ان مضامین کی پہچان کرسکتے ہیں جن میں ان کی ترقی خاطر خواہ ہے اور ان مضامین کی بھی جن میں ان کے لیے ترقی واصلاح کی گنجائش زیادہ ہے۔
6. تدریس بہ امداد کمپیوٹر استاد اور طلبہ دونوں کو غیر ضروری محنت سے بچاتی ہے۔ اساتذہ کو ایک ہی قسم کے تعلیمی تجربات کو ہر طالب علم کے لیے بار

بار ترتیب دینے اور ہر اسٹیج پر ان کا اندازہ قدر مقرر کرنے میں اپنا وقت اور محنت ضائع نہیں کرنی پڑتی۔ کیونکہ یہ سب پہلے سے کمپیوٹر پروگرام میں محفوظ ہوتے ہیں۔

7. تدریس بہ امداد کمپیوٹر تجربات کا ایک وسیع میدان فراہم کرتی ہے جو کسی دوسری طرح سے طلبہ کو حاصل نہیں ہوتا۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر ملٹی میڈیا کی حیثیت سے کام کرتی ہے جس میں سمعی و بصری امداد کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور طلبہ کو محرک تکنیکوں جیسے چلتی پھرتی تصویروں، خاکہ کشی وغیرہ کے استعمال کے ذریعہ تصورات کو صاف صاف سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

8. جہاں روایتی طرز کا عملی مظاہرہ کافی مشکل ہو، ناممکن ہو یا خطرناک ہو، جہاں آلات آسانی سے دستیاب نہ ہوں یا جب حقیقی حالت کے تجربے میں غیر ممکنہ لمبا وقت درکار ہو، تو ان تمام حالات میں تدریس بہ امداد کمپیوٹر کا تمثیلی طرز (Simulation mode) کافی مفید ہوتا ہے۔

9. تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے ذریعہ سیکھنے والوں کو کثیر انتخابی سوالات سے کوئی بھی سوال چننے کے لیے دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جوابات کا ایک سلسلہ دیا جاسکتا ہے۔ جہاں ایک جواب دوسرے سے بہتر ہو۔ اس طرح کی تدریس میں طلبہ کو ہر انتخاب پر ایک فیڈ بیک ملتا رہتا ہے۔

10. تدریس بہ امداد کمپیوٹر بہت ساری مشق/ ڈرل فراہم کرتی ہے جو کم صلاحیت والے طلبہ کے لیے کافی مفید ہوتی ہے جب کہ باصلاحیت طلبہ اس سے گریز کرسکتے ہیں۔

11. تدریس بہ امداد کمپیوٹر سے طلبہ میں استدلال، معقولیت پسندی اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو بڑھاوا ملتا ہے۔

12. جو طلبہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کا استعمال کرتے ہیں وہ حصول علم میں خود رہنمائی کا راستہ اپناتے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی پیدا ہوجاتی ہے اور اساتذہ پر ان کا انحصار کم ہوجاتا ہے۔

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی حدود

جہاں تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے بہت سارے فوائد ہیں وہیں اس کے عملی نفاذ کی کچھ حدود بھی ہیں:

1. تدریس بہ امداد کمپیوٹر ایک نیا تعلیمی پیکیج کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ابھی تک تعلیمی عمل کا غیر منفک حصہ نہیں بن سکا ہے۔ نہ ہی اس کو وسیع مقبولیت ملی ہے جو اسے ملنی چاہیے۔

2. اگر چہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں تمثیلی طرز پر کیمیائی اور حیاتیاتی تجربات کیے جاسکتے ہیں لیکن دستی مہارت نہیں پیدا کی جاسکتی۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے پیکیج میں آلات کو ہاتھوں سے استعمال نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی کسی مشین پر دستی کام کیا جاسکتا ہے۔

3. تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے پیکیج کو بنانے میں اصل صرفہ زیادہ لگتا ہے۔ پیکیج کو بنانے میں اسٹاف پر خرچ زیادہ لگتا ہے اور وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہے۔

4. اکثر تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں مضمون کا مواد پرانا ہوجاتا ہے۔ اگر کورس پرانا ہوگیا تو اس پر صرف کی گئی رقم بیکار ہوجاتی ہے۔

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے استعمال سے متعلق مسائل

1. کمپیوٹر کو تعلیم میں استعمال کرنے کے لیے اساتذہ کو محرک کرنا اور ٹریننگ دینا مشکل کام ہے۔ اس نئی مشین سے ان میں ڈر بھی پیدا ہوسکتا ہے اور وہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی تیاری، مواد کے انتخاب اور استعمال میں زیادہ وقت دینے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ علاوہ ازیں وہ اسے اپنی ملازمت کے لیے خطرہ محسوس کرسکتے ہیں۔

2. ہوسکتا ہے کہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر پیکیج اساتذہ کی امیدوں پر پورا نہ اتر سکے۔ پیکیج پروگرامر اور اساتذہ کے مقاصد اور طریق تدریس مختلف ہوسکتے ہیں۔

3. کمپیوٹر کو لگانے میں انتظامی مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ خاص کر کمپیوٹر کے محل وقوع، اس کی مرمت، ہارڈ ویئر اور سوفٹ ویئر کی فراہمی وغیرہ میں طلبہ اور اساتذہ کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ انتظامی امور سے متعلقہ مسائل بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

4. تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی کوالٹی کو برقرار رکھنے کے لیے ٹیم ورک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک پیکیج کو بنانے میں مختلف مضامین کے ماہرین جیسے تعلیم و تدریس، پروگرامنگ، ہارڈ ویئر اور مضمون کے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے میں لمبا عرصہ لگ سکتا ہے۔

5. ہارڈ ویئر میں تیزی سے واقع تبدیلی سے یہ خدشہ بنا رہتا ہے کہ کہیں یہ ہارڈ ویئر متروک الاستعمال نہ ہوجائے۔ اگر زیادہ تر اداروں میں نیا کورس آجاتا ہے تو تب تک بنائے گئے پیکیج بیکار ہوجائیں گے۔

تدریس بہ امداد کمپیوٹر سے متعلقہ مذکورہ بالا مسائل پر قابو پانے کے لیے متعدد تعلیمی سوفٹ ویئر ترویج دینے کی ضرورت ہے۔ گو کہ ایسے کئی سوفٹ ویئر مختلف مضامین میں فروغ پا چکے ہیں پھر بھی تعلیمی میدان میں ان کو وسیع پیمانے پر استعمال کرنے کے لیے ان کی توثیق ضروری ہے۔

□□□

رؤف ظفر

ختم ہوتے آبی ذخائر

ذرائع مواصلات میں انقلابی پیش رفت اور آمدورفت میں حیرت انگیز سہولیات نے کرۂ ارض کو نوع انسانی کے لیے ایک گھر کی حیثیت دے دی ہے۔ اب یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی بڑا موسمی حادثہ یا سانحہ قطب شمالی یا قطب جنوبی میں واقع ہو اور دنیا کے دوسرے حصے اس سے متاثر نہ ہوں۔ حالیہ سونامی طوفان کی بازگشت پوری دنیا میں سنی گئی۔ اس طرح قطبین میں برف پگھلنے کی رفتار میں ذرا سی بھی تیزی آجائے تو پوری دنیا کے کان کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ دنیا بھر کے دریاؤں میں طغیانی آجاتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بحرالکاہل یا بحر ہند میں طوفان کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو دنیا کے دوسرے ممالک میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے کیونکہ اس کے اثرات قریبی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ ماحولیات میں آلودگی کے باعث جب کرۂ ارض کی بالائی سطح اوزون میں کمزوری پیدا ہوتی ہے تو تمام دنیا کے ماہرین خبردار ہوجاتے ہیں کیونکہ اس سے آنے والی خطرناک شعاعیں پوری دنیا کے لوگوں کو متاثر کرتی ہیں۔

کرۂ ارض کے اس طرح محدود ہوجانے اور کسی بھی موسمی اثرات کے ہمہ گیر ہونے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ زمین کے ماحول میں کوئی بھی خرابی ہو اور اس کے موسم میں کوئی بھی نئی تبدیلی دیکھنے میں آئے، ماہرین مشترکہ طور پر مل کر اس کا کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کرۂ ارض کے موسمی تغیرات کی سب سے بڑی وجہ اس کے ماحول کا آلودہ ہونا ہے۔ ماحول کی آلودگی اس کی فضا کو زہریلی بنا رہی ہے۔ لیکن مسئلہ صرف فضا کے زہرناک ہونے تک محدود نہیں۔ زمین کا موسم بھی بری طرح مجروح ہورہا ہے، اور جب موسم میں منفی تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں تو پھر چھوٹے اور بڑے شہروں میں رہنے والے تمام لوگ اس کی گرفت میں آجاتے ہیں۔

کرۂ ارض کے ماحول کی آلودگی اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے بارے میں اقوام متحدہ نے جو سروے رپورٹ کچھ عرصہ قبل جاری کی تھی۔ وہ اتنی تشویشناک ہے کہ اس پر ہر شخص کا فکر مند ہونا ایک فطری امر ہے کیونکہ اب زمین کی آلودگی کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ ہر اس مرد، عورت، بچے، بوڑھے کا مسئلہ ہے جو اس زمین پر رہتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے جب زمین نے یہ ''سگنل'' بھیجنے شروع کیے کہ صورت حال خراب ہے۔ اس کا کچھ تدارک ہونا چاہیے لیکن انسانوں نے ان اشاروں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ پہلے پہل یہ اشارے بڑے خفیف تھے مثلاً عقاب کی ایک نایاب نسل کے انڈے وقت سے پہلے کریک ہوگئے کیونکہ ان پر کسانوں نے ڈی ڈی ٹی چھڑک دیا تھا۔ پھر ایمزان کے گھنے جنگلوں میں آسمان کو چھونے والے دھوئیں کے بادل اٹھتے دیکھے گئے کیونکہ یہاں کے کسانوں نے زمین کو ہموار کرنے کے لیے انھیں آگ لگادی تھی لیکن یہ تو کرۂ ارض پر اس قسم کے رونما ہونے والے سیکڑوں واقعات میں سے صرف دو واقعات تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گذشتہ چار دہائیوں سے انسان کا ہر قدم کرۂ ارض کے ماحول کو زہرناک بنانے کی طرف اٹھ رہا ہے۔ مثلاً ایک اور ہولناک مثال یہ ہے کہ شمالی اٹلانٹک کے ساحلوں پر زہریلا فالتو مواد پھیلنے سے کروڑوں مچھلیاں ہلاک ہوگئیں جس سے کناڈا کے تیس ہزار ماہی گیر بیکار ہوگئے۔ چین میں اس سے زیادہ بڑا سانحہ ہوا۔ چینیوں نے دریاؤں کے کنارے درخت کاٹ دیے جس سے سیلابوں نے آبادیوں میں تباہی مچادی، 36000 افراد ہلاک اور ڈیڑھ کروڑ بے گھر ہوگئے۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ میں ماحولیاتی خرابیوں کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ساحلی علاقے تباہی سے ہمکنار ہورہے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق دنیا میں دو ارب افراد ساحلوں پر آباد ہیں اور بین الاقوامی اقتصادیات میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر افراد کا پیشہ ماہی گیری ہے لیکن صورت یہ ہے کہ ساحلی علاقوں میں مچھلیاں جن قدرتی جگہوں اور چٹانوں میں پرورش پاتی ہیں وہ آہستہ آہستہ ختم ہورہی ہیں اس لیے مچھلیوں کے شکار میں ایک تہائی کمی آئی ہے۔ اندازہ ہے کہ اس سے جنوب مشرقی ایشیا میں کم از کم ایک ارب افراد کا روزگار متاثر ہوگا۔ ان ساحلوں پر خطرناک فضلہ پھینک دیا جاتا ہے۔ رپورٹ کا دوسرا حصہ قابل نوش اور تازہ پانی سے تعلق رکھتا ہے۔ تقریباً ہر جاندار کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے صاف پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ایک صدی میں قابل نوش پانی کی طلب میں چھ گنا اضافہ ہوا ہے۔ لوگ اب دستیاب قابل نوش پانی کا 54 فیصد استعمال کرتے ہیں اور اس طلب میں مزید اضافہ صورت حال کو خطرناک بنادے گا۔ دنیا کے تقریباً تمام ملک پانی کی قلت کا شکار ہیں۔ زراعت اور صنعت اس سے بہت متاثر ہورہے ہیں۔ پانی کی قلت کے جو اسباب بتائے جاتے ہیں، ان میں کھاد کا استعمال اور دریاؤں کا زہرآلود ہوجانا

ہے۔ اب نالوں کا پانی اور گندگی براہ راست دریاؤں میں شامل ہورہی ہے جس سے پانی پینے کے قابل نہیں رہا۔ لوگ اب دریاؤں سے اتنا پانی نکال رہے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے دریاؤں کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ یہ سمندر میں گرنے سے پہلے خشک ہوجائیں گے۔

دنیا میں زرعی اراضی کا بھی برا حال ہے۔ کرۂ ارض کی ایک تہائی زمین کو خوراک کی پیداوار میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ لیکن اس زمین کا تین چوتھائی حصہ اچھی حالت میں نہیں۔ اب یہ زمین رہائشی مقاصد کے لیے استعمال ہورہی ہے۔ چالیس فیصد سے زیادہ زرعی زمین اپنی طاقت کھو بیٹھی ہے۔ لاطینی امریکہ میں یہ مسئلہ زیادہ سنگین ہے۔ زمینوں پر کرم کش ادویات کے استعمال سے مفید کیڑے مکوڑے بھی ہلاک ہوجاتے ہیں۔ زیر زمین پانی بھی ان ادویات کی وجہ سے زہریلا ہوجاتا ہے، کھیتی باڑی کے جدید طریقوں سے بلاشبہ پیداوار بڑھ گئی ہے لیکن فصلوں میں غذائیت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ رپورٹ کا ایک حصہ چراگاہوں سے متعلق ہے جو کہ پرندوں، جانوروں کی پرورش کا سب سے بڑا ذریعہ شمار ہوتی ہیں۔ انسانوں کی تمام خوراک انہی چراگاہوں میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن چراگاہوں کی اس اہمیت کے مقابلے میں صورت حال یہ ہے کہ امریکہ میں تقریباً تمام چراگاہیں اب اپنی اصلی حالت میں نہیں رہیں۔ دوسرے ملکوں میں دریاؤں کے کٹاؤ سے ان چراگاہوں کو رہائشی علاقوں میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ رپورٹ کا آخری حصہ فضلات کے بارے میں ہے اور سب سے زیادہ اہم ہے۔ ماہرین کے مطابق دنیا میں پرندوں کی جتنی اقسام پائی جاتی ہے ان میں سے دو تہائی جنگلات آب و ہوا کو معمول پر رکھنے اور پانی کا ذخیرہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی بھی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ جنگلات کے بارے میں ماہرین کی رپورٹ یہ ہے کہ روس اور کناڈا کے علاوہ صنعتی ممالک نے اپنے تمام جنگلات کو صاف کردیا ہے جس سے پوری دنیا میں ماحولیاتی نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ اقوام متحدہ کی اس رپورٹ میں چارٹوں اور نقشوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح زرعی اراضی تباہ و برباد ہورہی ہے اور یہاں رہائشی مکانات، کارخانے، فیکٹریاں قائم ہورہی ہیں۔ دوسرا یہ اراضی اپنی پیداواری قوت دن بدن کھورہی ہے۔ اسی طرح سمندروں کی آبی مخلوق بھی زہریلے فضلے سے تباہی سے دوچار ہورہی ہے۔ رپورٹ میں ایک حیرت انگیز انکشاف یہ کیا گیا ہے کہ گذشتہ ایک صدی میں دنیا کے نصف قدرتی آبی ذخائر ختم ہوچکے ہیں۔ ان کے گردونواح میں رہنے والے پرندے اور جانور بھی تباہ ہوئے ہیں۔ سمندری چٹانیں جہاں آبی مخلوقات اپنے ٹھکانے بناتی ہیں ان میں سے 58 فیصد انسانی سرگرمیوں کی وجہ سے ختم ہوگئی ہیں۔ 80فیصد چراگاہیں زمین کے کمزور ہوجانے کی وجہ سے خراب ہورہی ہیں۔ سرسبز وشاداب اراضی کا 20فیصد صحراؤں میں تبدیل ہورہا ہے اور زیرزمین پانی کی سطح مزید کم ہورہی ہے۔ اس میں ملاوٹ ہوتی جارہی ہے۔ رپورٹ کے آخر میں کہا گیا ہے کہ کرۂ ارض کی یہ بدلتی ہوئی حالت نوع انسانی کے لیے ایک خطرے سے کم نہیں بالخصوص اس سے یہاں کے رہنے والوں کے روزگار کو بہت زیادہ خطرہ ہے۔

□□□

(بشکریہ ''آزاد ہند'' کلکتہ، 8اکتوبر 2005)

مجموعۂ نغز

مصنف: قدرت اللہ قاسم

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا یہ مشہور تذکرہ، دو جلدوں میں تھا جسے فاضل مرتب پروفیسر محمود شیرانی نے یکجا کردیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ یہ تذکرہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ انھیں آزاد کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 492، قیمت -/268روپے

عربی ادب کی تاریخ (تین جلدوں میں)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

مدارس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان وادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں تھی جس میں عربی ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان کی گئی ہو۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں زمانۂ جاہلیت، دوسری جلد میں حضرت محمدؐ کے عہد سے خلفائے راشدین کے عہد نیز اموی دور اور تیسری جلد میں عباسی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: جلد اول: 352، جلد دوم: 390، جلد سوم: زیر طبع
قیمت: جلد اول: 86 روپے، جلد دوم: 91 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے40%کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

عبیدالرحمن

سنڈے ہو یا منڈے، روز کھائیں انڈے

سائنسی تحقیقات نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ انڈا انسان کے لیے ایک انتہائی صحت بخش غذا ہے۔ لہٰذا اسے مثالی غذا (Ideal Food) تصور کیا جا رہا ہے۔ اب تک دودھ کو مثالی غذا تسلیم کیا جاتا رہا ہے مگر دونوں کی غذائیت کا موازنہ کرنے پر یہ بات نمایاں ہوگئی ہے کہ انڈا دودھ سے کئی گنا زیادہ غذائیت سے بھرپور ہے۔ دودھ میں ملاوٹ ایک عام بات ہے جس سے اس کی اصلیت مجروح ہوتی ہے مگر انڈا قدرت کا وہ عطیہ ہے جس میں ملاوٹ کی گنجائش نہیں ہے۔

''سنڈے ہو یا منڈے روز کھائیں انڈے'' یہ نعرہ ایک پیغام کی صورت میں مختلف ذرائع ابلاغ سے ہم تک پہنچتا رہا ہے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ یہ نعرہ کیوں کر بلند کیا گیا ہے اور حکومت اس طرف سنجیدگی سے رجوع کیوں کر رہی ہے؟ آیئے ایک نظر ڈالیں:

انڈا ہر عمر کے انسان کے لیے مفید ہے۔ بچوں کے لیے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ یہ واحد غذا ہے جس سے پروٹین، معدنیات اور وٹامن کی درکار مقدار حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ وٹامن C کے لیے ایک چھوٹے سائز کے ٹماٹر کا استعمال موزوں ہے کہ وٹامن C انڈا سے حاصل نہیں ہو پاتی ہے۔ انڈا سے حاصل ہونے والی پروٹین حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے بڑی اہم ہے کیوں کہ یہ انسانی جسم میں پوری طرح ہضم ہو جانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس میں امینو ایسڈ (Amino Acid) کی بہتر شکل موجود رہتی ہے لہٰذا یہ سبزیوں سے حاصل ہونے والی پروٹین سے کئی درجہ بہتر ہے۔

انڈا اور دودھ دونوں ہی کا جسم سے اخراج ہوتا ہے۔ دونوں ہی غذائیت کے اہم ذرائع ہیں اور بچوں کے لیے خاص طور پر مفید۔ مگر بطور غذا ان میں سے کون زیادہ بہتر ذریعہ ہے اس پر جب تحقیقات کی گئیں تو معلوم ہوا کہ انڈا میں دودھ سے کہیں زیادہ پروٹین، روغنیات، وٹامن A، (Riboflavin) B2، (Cynocobalamin) B12 اور فولک ایسڈ موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں دودھ سے زیادہ فولاد (Iron) اور وٹامن D بھی پائے جاتے ہیں جو بچوں کی ہڈیوں کی تشکیل میں حد درجہ معاون ہیں۔

ذیل کے جدول میں انڈا اور دودھ کی غذائیت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جدول: انڈا اور دودھ کی غذائیت — تقابلی جائزہ

غذائی اجزا	انڈا (100 گرام)	دودھ (100 گرام)
پانی	73.7	81.0
پروٹین	13.5	4.3
روغن	13.7	8.8
کیلوری مقدار (حراری تخمینہ)	173.0	117.0
فاسفورس	0.22	0.13
فولاد (ملی گرام)	2.1	0.20
وٹامن A (I.U.)	2200.0	162.0
وٹامن B1 (تھائمین) (ملی گرام)	0.13	0.04
وٹامن B2 (رائبوفلیون) (ملی گرام)	0.35	0.19

انڈا — ایک بہترین ناشتہ

سائنسی نقطۂ نگاہ سے صبح کا بہترین ناشتہ وہ ہے جو بالغوں کو دن بھر کے لیے درکار غذائیت کا 1/5 واں حصہ فراہم کرے اور بچوں کو ایک چوتھائی۔ ناشتے میں پروٹین کی مقدار 9-1 سال کی عمر کے بچوں کے لیے 8 تا 13 گرام ہونی چاہیے اور 18-9 سال کی عمر کے لیے 14 تا 21 گرام ضروری ہے۔ یہ مقدار ایک عدد انڈا اور 240 گرام دودھ سے پوری کی جا سکتی ہے۔ ان سے جسم کو درکار ضروری امینو ایسڈ بھی فراہم ہوگا۔ انڈے سے حاصل ہونے والی پروٹین پوری طرح ہضم ہو جاتی ہے اور اس ہضم شدہ پروٹین کا 97 فیصد جسم کے ذریعے استعمال کر لیا جاتا ہے۔

انڈا — ایک سبزی

مرغی کے انڈے جو پنجرے میں مرغ کی غیر موجودگی سے حاصل ہوتے ہیں انھیں سبزی والے انڈے سے موسوم کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ پوری طرح بانجھ ہوتے ہیں لہٰذا انھیں آلو، بیگن، گوبھی یا دیگر سبزی کی طرح ہی سمجھ سکتے ہیں اور انھیں سبزی خور حضرات کھا سکتے ہیں۔

مرغ کی غیر موجودگی سے انڈا بارآوری اور سینے جانے کی اہلیت نہیں رکھتا لہٰذا اس میں زندگی نہیں پائی جاتی اور یہ کبھی چوزے میں تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔ ایسے انڈے سبزی خور لوگوں کے لیے انڈے کی تمام تر افادات کے

باوجود ایک سبزی ہی ہے لہٰذا ایسے انڈوں کے استعمال سے گریز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

انڈا دودھ سے سستا

ایک انڈا اپنی تغذیاتی خصوصیات کی بنا پر 200 گرام دودھ کے برابر ہے۔ قیمت کے اعتبار سے ایک انڈا 200 گرام دودھ سے سستا ہے لہٰذا کم قیمت پر انڈا دودھ سے بہتر غذائیت فراہم کرتا ہے۔

انڈا۔ کینسر کے لیے اکسیر

روزلن انسٹی ٹیوٹ، ایڈن برگ کے معروف سائنس داں ایان ولمٹ جنھوں نے 1977 میں 'ڈولی' نام کی بھیڑ کلوننگ تکنیک سے پیدا کی تھی، انھوں نے مرغیوں کی تبدیل شدہ شکلیں پیدا کی ہیں جن کے انڈے کینسر کی دوا کے لیے استعمال کیے جائیں گے۔ اس کے لیے انھوں نے مرغیوں کی جینی بناوٹ میں ایسی تبدیلی کی ہے کہ انڈے کی سفیدی میں پروٹین کی مقدار اور اس کے معیار میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہ پروٹین خاص کر بیضہ دانی اور پستان کے کینسر مخالف دواؤں کی تیاری میں نئے امکانات روشن کر رہی ہے۔

انڈے کی دیگر خصوصیات

1. انڈے کی Albumin (سفیدی) زہر کے اثرات کو زائل کر دیتی ہے۔ لہٰذا مہلک چیزیں اگر غلطی سے کھا لی جائیں تو انڈے کی سفیدی کا استعمال کرنا چاہیے۔
2. معدہ کی سوزش، اسہال اور جسم میں پانی کی کمی کی شکایت دور کرنے میں انڈا بہت معاون ہے۔
3. انڈے کی زردی خون کے کولسٹرول کی سطح کو کم کرتا ہے لہٰذا دل کی بیماری کو روکنے میں مددگار ہے۔ انڈے میں موجود Taurine دل کے امراض کے تئیں مدافعتی قوت رکھتا ہے۔
4. انڈے کی زردی سائلک ایسڈ (Sialic Acid) کا عمدہ ذریعہ ہے جو جراثیم کش ہے اور سوزش یا ورم کو ختم کرتا ہے۔
5. انڈے میں Selenium اور Iodine کی اچھی مقدار ہوتی ہے جو حاملہ عورتوں اور نوعمر لڑکیوں کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

□□□

M-2, Regal Building, Street-6,
Zakir Nagar, New Delhi-110 025.

لفظ

شاعر: آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار اردو کے دیدہ ور نقادوں میں ہوتا ہے مگر وہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری ماضی کے اکتسابات کی حامل، حال کے میلانات کی ترجمان اور مستقبل کے امکانات کی نقیب ہے۔ سرور صاحب کی زندگی میں ان کے تین شعری مجموعے "سلسبیل"، "ذوق جنوں" اور "خواب اور خلش" شائع ہوئے۔ "لفظ" ان کا آخری شعری مجموعہ ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/64 روپے

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خاں

یہ کتاب ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے سولہ علمی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اردو صوتیات، اقبال کا صوتی آہنگ، غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت، اردو لغت نویسی کے مسائل وغیرہ مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات: 230، قیمت: -/18.50 روپے

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: پروفیسر شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے، جدیدیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرز احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات: 292، قیمت: -/114 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: پروفیسر شمیم حنفی

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات، 239، قیمت: -/96 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

پنڈت جواہر لال نہرو کا سفر یورپ

تاریخ میں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کے اثرات فوری طور پر ظاہر نہیں ہوتے۔ لیکن وہ کئی نسلوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ 1926-27 میں پنڈت جواہر لال نہرو کا یورپ اور روس کا سفر تھا۔ اپنی بیوی کملا کی بحالیِ صحت کے لیے یورپ جانے پر مجبور، نہرو کو تقریباً اکیس مہینے بیرون ملک میں قیام کرنا پڑا حالاں کہ انھیں سوئٹزر لینڈ میں قیام کرنا تھا، جہاں پر ان کی بیوی بحالیِ صحت کے لیے قیام پذیر تھیں، لیکن ان کی بے قرار آتما انھیں فرانس، جرمنی، ہالینڈ، برطانیہ اور روس کے سفر پر لے گئی۔ بیرونی ملکوں کے اپنے عارضی قیام کے دوران وہ بعض نئے تصورات سے روشناس ہوئے جن سے ہندوستان اب تک مکمل طور سے ناآشنا تھا۔ جب وہ واپس لوٹے تو وہ ان تصورات سے آراستہ تھے جو آئندہ پچاس برسوں میں ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات کو متاثر کرنے والے تھے۔ دراصل اس کے اثرات آج بھی واضح ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم ان نئے تصورات کی نشاندہی کریں؛ بہتر ہوگا کہ 1926-27 میں نہرو کے سفر یورپ سے قبل ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیں۔

ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے مستحکم ہونے کے بعد، اول الذکر اپنے تمام ہمسایوں سے دور ہوگیا۔ ہندوستان کے لیے اب باہری دنیا کا مطلب صرف برطانیہ اور اس کی نوآبادیاں تھیں۔ اس کے تعلقات صرف برطانوی سلطنت کے ممالک کے ساتھ رہ گئے تھے۔ برطانیہ کے دوست اس کے دوست اور اس کے دشمن ہندوستان کے دشمن تھے۔ ہندوستان کو بیرونی ممالک میں اپنی فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں، کبھی مصر اور کبھی یورپ، بحیرۂ روم کے علاقوں میں مشرق وسطیٰ اور کریمیا وغیرہ۔

ہندوستان کی آزادی کے لیے ہونے والے مظاہروں سے برطانوی کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ گوکھلے، تلک یا لالہ لاجپت رائے کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑ سکے تھے۔ ان میں سے بعض نے ایک تنظیم قائم کی جسے 'انڈین لیگ' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لندن میں قائم اس تنظیم نے نہ صرف برطانیہ میں بلکہ یورپ میں بھی ہندوستان کی آزادی کے لیے مظاہرے کیے۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ غدر پارٹی کے لوگوں نے کچھ توجہ حاصل کی۔ یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران انھوں نے جرمنی کی مدد سے ایک مہاجر حکومت بھی تشکیل دی۔ خلافت تحریک کے ذریعے پین اسلامی (Pan-Islamic) خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔ اسی کا اثر تھا کہ ہزاروں مسلمان ترکی کے طویل سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے سیکڑوں لوگ مارے گئے۔ پین اسلامی خواب ادھورا ہی رہ گیا۔

جس وقت گاندھی جی نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو ایک وسیع بنیاد فراہم کرتے ہوئے ایک زبردست مہم کا آغاز کیا، تو انھوں نے یہ بات واضح کر دی کہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی ہندوستان کے اندر ہی لڑی جائے گی۔ اس لیے، انھوں نے انڈین لیگ کو بند کرنے کی مانگ کی۔

1920 کے اواخر میں کانگریس کی پالیسیوں نے دوسری نوآبادیوں میں قومی آزادی کی تحریکات کو متوجہ کرنا شروع کیا۔ وہ کانگریس کے ساتھ برادرانہ تعلقات کے خواہاں تھے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب بعض لوگوں جیسے مصر کی وفد پارٹی نے بھی اپنے نمائندے بھیجے۔

جب 1927 میں نہرو یورپ پہنچے تو یہ اس وقت کے یورپ سے قدرے مختلف تھا جسے 14 برس قبل انھوں نے چھوڑا تھا۔ مختلف نئے رجحانات سامنے آرہے تھے۔ جرمنی لیگ آف نیشنز میں شامل ہوگیا تھا۔ ایک خوش بخت سپاہی پلسندسکی (Pilsndski) نے پولینڈ پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ ماسرک (Masaryk) کو دوبارہ نوتشکیل شدہ چیکوسلواکیا کا صدر منتخب کرلیا گیا تھا۔ وہاں پر متعدد اہم واقعات رونما ہو رہے تھے، لیکن کوئی بھی واقعہ بروسیلس (Brussels) میں منعقد ہونے والے مظلوم ممالک کی کانگریس سے زیادہ اہم نہیں تھا۔ پنڈت نہرو نے اس میں انڈین نیشنل کانگریس کے ایک نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی (جس کی اجازت انھوں نے ہندوستان کو خط لکھ کر حاصل کی تھی)۔ اس کانفرنس نے، جس کے تحت سامراجیت کے خلاف لیگ کی تشکیل ہوئی، برطانیہ کے عظیم مزدور رہنما جارج لینسبری (George Lansbury) جیسی اولوالعزم شخصیت کو متوجہ کیا جس نے اس کانفرنس کی

صدارت کی، اس کے علاوہ مختلف ممالک کی قومی تنظیموں کے نمائندوں بشمول جاوا، ہند چین، فلسطین، شام، مصر، افریقہ، چین اور میکسیکو وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ یورپ اور دوسرے ممالک کی بائیں بازو کی تنظیموں کے متعدد رہنما بھی وہاں موجود تھے۔

بروسیلس (Brussels) کی اس کانفرنس میں نہرو اسٹیفن ژوئیگ (Stefan Zweig) اور ارنسٹ ٹالر (Erest Toller) جیسے شاعروں سے ملے جو صداقت اور آزادی کے جذبات سے لبریز تھے۔ نہرو عظیم ہند چینی رہنما سے بھی ملے جو بعد میں ہو چی من (Ho Chi Minh) کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہیں پر نہرو میڈم سن یات سین (Sun Yat Sen) سے ملے جو آگے چل کر قومی تحریکات میں نمایاں طور سے معروف ہوئیں۔ اسی دوران پنڈت نہرو روماں رولاں (Romaini Rolland) اور آئنسٹائن (Einstein) سے بھی ملے۔

ہندوستان کی آزادی کے مسئلے پر برطانیہ کے مزدور رہنماؤں کے مبہم رویے نے نہرو کو مشتعل کر دیا اور انھیں روس کے کمیونسٹوں سے قریب کر دیا۔ سامراجیت کے سب سے بڑے مرکز برطانیہ کو روس اپنا اصل دشمن سمجھتا تھا۔

بروسیلس کانفرنس نے نوآبادیوں اور غریب ممالک کے بعض مسائل کو سمجھنے میں پنڈت نہرو کی مدد کی۔ اس نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو ب وسیع بنیاد فراہم کی۔ سرمایہ داری اور استعماریت ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ سامراجیت محض سرمایہ داری کی انتہائی شکل تھی۔ نہرو کے خیال میں سرمایہ داری ہی استعماریت کے شیطانی نظام کا منبع تھی۔ جب تک سرمایہ داری حکومت قائم رکھنے کے لیے جمہوری اداروں کی مشینری کا استعمال کر سکتی تھی، س نے جمہوریت کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ جب یہ ممکن نہ ہو سکا تو اس نے جمہوریت کو ترک کر کے فسطائیت کو اس کی تمام شدت پسندی اور دہشت کے ساتھ اختیار کر لیا۔ پنڈت نہرو اسے پسند نہیں کرتے تھے۔

جس وقت وہ برلن میں تھے، نہرو کو نومبر 1927 میں سوویت ریپبلک کی سالانہ تقریبات میں شرکت کے لیے ماسکو جانے کا دعوت نامہ ملا، حالاں کہ ماسکو کا ان کا یہ سفر مختصر مدت کے لیے تھا، نہرو روسی رہنماؤں سے ان کے مسائل کے تئیں ان کے رویے اور کوششوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ سوویت روس کے اس سفر سے معلوم ہوا کہ ہندوستان اور روس کے بنیادی مسائل یکساں تھے۔ جب نہرو 1927 کے آخر میں ہندوستان واپس لوٹے۔ وہ عالمی برادری کے تناظر میں ہندوستان کی واضح تصویر دیکھنے کے قابل تھے۔ انھوں نے کانگریس میں ایک پلاننگ کمیٹی تشکیل دینے کے لیے پیش قدمی کی جو کہ پانچ سالہ منصوبوں کی ابتدائی شکل تھی۔ اقتصادی، سماجی اور سیاسی معنوں میں ہندوستان کی آزادی سے متعلق ان کے خیالات یقینی اور واضح ہو گئے تھے۔ آنے والے دنوں میں انھیں عملی طور پر ان خیالات کی ترجمانی کرنی تھی۔

1930 کی پوری دہائی میں نہرو واحد ہندوستانی رہنما تھے جو یورپ اور افریقی، ایشیائی ممالک میں ہونے والی ترقی کے تئیں حساس تھے۔ جب کہ اکثر ہندوستانی رہنما باہری دنیا سے علاحدہ ہو کر ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے، نہرو ہندوستان کی جدوجہد کو عالمی امن کے لیے جاری وسیع جدوجہد کی حیثیت سے اور دنیا کو سامراجیت کے شکنجوں سے آزاد کرانے کی لڑائی کی حیثیت سے دیکھتے تھے جس نے دنیا کو ایک عفریت کی طرح جکڑ رکھا تھا۔ فسطائیت اور نازیت کے لبادے میں سرمایہ داری اور سامراجی قوتوں کی حرکتوں سے وہ بے حد پریشان تھے۔ ان کی نظر میں ان قوتوں کی کامیابی آزادی کی قوتوں کے لیے ایک بڑا خطرہ تھی۔ ایک اور اہم رہنما سبھاش چندر بوس، جو دوسرے رہنماؤں کے مقابلے میں عالمی واقعات کے تئیں زیادہ حساس تھے، ہندوستان کی آزادی کے لیے کسی بھی طاقت کی اعانت حاصل کرنے کے حق میں تھے، خواہ وہ فسطائیت ہو یا نازیت۔ دوسری طرف پنڈت نہرو کے خیال میں نازیت اور فسطائیت بذات خود برائی کی علامتیں تھی۔ اور وہ کسی بھی صورت میں ان سے مصالحت کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ جس وقت یورپ کی عظیم طاقتیں اٹلی کے فسطائی رہنما مسولنی سے ہاتھ ملانے میں فخر محسوس کر رہی تھیں، نہرو نے مسولنی کی دعوت کو ٹھکرا دیا اور جب مسولنی کی فوجوں نے اتھوپیا پر حملہ کیا تو پنڈت نہرو نے یورپ کے طاقتور ممالک کے اکثر رہنماؤں کے برخلاف جو بزدلی کے ساتھ اٹلی کی فوجوں کے ہاتھوں ایتھوپیائی باشندوں کا قتل عام دیکھ رہے تھے، فسطائیت کی پیش قدمی اور مختلف مقامات پر جاری آزادی کی تحریکات کو درپیش اسی خطرے کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ وہ منچوریا اور چین پر جاپان حملوں سے بھی کم فکر مند نہیں تھے۔ انھوں نے یورپی ممالک کی علاحدگی کے خلاف اپنے غم و غصے کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ غلام ہندوستان اپنی اخلاقی ہمدردی کا اظہار کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن نہرو نے چین کو ایک ہندوستانی میڈیکل مشن بھیج کر مدد کی اور جنرل شیانگ کائی شیک کے ساتھ ذاتی تعلقات قائم کیے۔ انھوں نے جاپان کی پیش قدمی کے خلاف ہندوستانی عوام کے خیالات کو منظم کیا۔

حالاں کہ یہ درست ہے کہ غلام ہندوستان کی آواز کو لیگ آف نیشنز میں بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ نہ صرف یہ کہ برطانوی سامراجیت کے شدید مخالف تھے بلکہ وہ نازیت، فسطائیت اور عسکریت کی پیش قدمی کے بھی خلاف تھے۔ یہ بڑی حد تک اس وجہ سے تھا کہ پنڈت نہرو نے ہندوستانی عوام کو ہٹلر اور مسولنی کی کامیابی سے پورے عالم میں آزادی کی تحریکات کو درپیش خطرات سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کو اس بات کی تعلیم دیتے تھے کہ ہندوستان کی لڑائی عالمی تحریک آزادی کا ایک اہم حصہ ہے۔ انھوں نے لوگوں کو عالمی اور قومی واقعات کے تعلق سے باخبر کیا۔ مہاتما گاندھی نے جو اپنی ساری توجہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں صرف کر چکے تھے، امور خارجہ کو مکمل طور سے نہرو کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ کانگریس کا کوئی بھی اجلاس ایسا نہیں ہوتا تھا، خواہ وہ ورکنگ کمیٹی ہو یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی، جو نہرو کے ذریعے پیش کی گئی قرارداد کو تسلیم اور قبول نہ کرتا ہو، جو ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کو بڑے پیمانے پر سامراجیت، نازیت اور فسطائیت مخالف تحریکات یا انسانیت کے ایک کچلے ہوئے طبقے کو برطانیہ، فرانس یا دوسری چھوٹی استعماری طاقتوں سے آزادی کی جدوجہد کا ایک حصہ بنانے کے لیے ہوتے تھے۔

دوسری عالمی جنگ سے تقریباً ایک سال قبل کانگریس نے اپنے ہری پور اجلاس میں ''خارجہ پالیسی اور جنگی خطرات'' پر ایک قرارداد منظور کی۔ نہرو کے ذریعے تیار کی گئی اس قرارداد میں کہا گیا کہ ہندوستان کے عوام اپنے ہمسایوں اور تمام ممالک کے ساتھ امن اور دوستی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ اپنے درمیان تمام تنازعات کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک قوم کی حیثیت سے اپنی خودمختاری اور آزادی کے لیے کوشاں وہ دوسروں کی آزادی کے بھی خواہاں تھے اور بین الاقوامی تعاون اور بھائی چارے کی بنیاد پر اپنی قوت مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بین الاقوامی تعاون کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ بین الاقوامی تنازعات کی جڑیں مستحکم تھیں اور ایک ملک دوسرے کو دبائے ہوئے تھا اور ہر طرف سامراجیت کی حکمرانی تھی۔ اس لیے مستقل طور پر امن عالم کے قیام کے لیے سامراجیت اور انسانوں کے ذریعے دوسرے انسان کے استحصال کو ختم کرنا ضروری تھا۔

کانگریس نے واضح طور پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہندوستان اس سامراجی جنگ میں حصہ نہیں لے گا اور برطانوی سامراج کے مفاد کے لیے اپنے آدمیوں اور وسائل کا استحصال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ نہ ہی ہندوستان اپنے عوام کی منظوری کے بغیر کسی لڑائی میں شریک ہوگا۔ اس طرح کانگریس نے ہندوستان میں چل رہی جنگ کی تیاریوں کو مکمل طور سے مسترد کر دیا۔

پنڈت نہرو ان جوشیلے قوم پرستوں کے قطعی خلاف تھے جو ہندوستان کی آزادی کے لیے برطانیہ کی پریشانی کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ نازیت اور فسطائیت جیسی برائیوں سے کسی طور مصالحت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ جس وقت دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اس وقت پنڈت نہرو ایشیا کے دو عظیم ممالک کے درمیان تعلقات مستحکم کرنے کی غرض سے چنگنگ میں تھے۔ سبھاش چندر بوس نے جن کا نقطۂ نظر مختلف تھا، ہندوستان سے فرار ہوکر جرمن اور پھر جنوب مشرقی ایشیا پہنچے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد ڈالی۔

1945 میں جیل سے رہائی کے بعد بھی نہرو نے دوبارہ وہی راستہ اختیار کیا اور دبے کچلے عوام کے لیے اپنی آواز بلند کی۔ انھوں نے جنوب مشرقی ایشیا کا سفر کیا اور جب ہالینڈ نے انڈونیشیا پر حملہ کیا تو نہرو ہندوستان کے ساتھ انڈونیشیائی عوام کی جانب تھے۔ برما کی آزادی کے ساتھ ہی انھوں نے نئی دہلی، رنگون اور جکارتا کے مابین تعلقات مستحکم کیے تاکہ ایشیا اور افریقہ میں آزادی کی تحریکات کی مدد کی جا سکے۔

دراصل 27-1926 میں یورپ اور روس کے اپنے مختصر سفر کے دوران جن تصورات کو نہرو نے قبول کیا تھا وہ آزاد ہندوستان کی پالیسیوں کے لیے رہنما بنیں، نہ صرف منصوبہ بند ترقی کے ذریعے اقتصادی اور سماجی انصاف کے لیے بلکہ ہندوستان کی خارجہ پالیسیوں کے لیے بھی جس کی بنیاد سامراجیت فسطائیت اور نسل پرستی کی مخالفت پر تھی۔ ہندوستان کی آواز ہمیشہ مظلوم ممالک کے استحصال کے خلاف اور ان کی آزادی کے لیے اٹھتی تھی۔ خواہ وہ ایشیا ہو یا افریقہ، قومی آزادی کی ہر تحریک اور سب سے بڑھ کر عالمی امن قائم کرنے کی ہر کوشش کی مدد کی جاتی تھی۔ ہندوستان نے جارحیت کی ہر جگہ مخالفت کی جہاں بھی اس نے سر اٹھایا، خواہ وہ کوریا میں ہو یا مصر یا پھر ہند چین میں۔ اور ہندوستان کی حمایت میں اتنی طاقت تھی کہ اقوام متحدہ کی مجالس میں بڑی طاقتوں کو اس کی آواز پر غور کرنا پڑتا تھا۔ ہندوستان نے ایک تیسری طاقت کو وجود میں لانے میں مدد کی جو آزاد ممالک پر مشتمل تھا، جس میں سب ایک ساتھ متفق ہوکر کھڑے تھے اور کوئی بھی کسی عالمی طاقت کے ساتھ شریک نہیں تھا اور اس کا مقصد امن عالم کا قیام تھا۔

□□□

تحریر: اروند گرٹو
ترجمہ: رئیس احمد

تھامس پین

تھامس پین امریکہ کے ایک ایسے انقلابی فلسفی تھے، جو اٹھارھویں صدی میں بیسویں صدی کا فلسفیانہ تصور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں جن تین ممالک کے تعلقات پر بے باک رائے زنی کی ہے ان میں امریکہ، انگلینڈ اور فرانس شامل ہیں۔ انسانی تکالیف کو محسوس کرتے ہوئے تھامس پین کے دل میں باغیانہ جذبات پیدا ہوئے۔ وہ جس زمانے میں پیدا ہوئے اس وقت ظلم و زیادتی، غیر انسانی برتاؤ اور غلامی کی روایت اپنے عروج پر تھی۔ وہ پہلے انسان دوست تھے جنھوں نے اس دور میں عوام کے درد کو سمجھنے کی کوشش کی اور جمہوریت کا پہلا سبق پڑھایا۔ شاہی نظام کے قدیم اور دقیانوسی تصورات کو انھوں نے کاری ضرب لگائی۔ اور اپنے فلسفیانہ افکار و نظریات سے ایک نئی دنیا آباد کی۔ وہ قنوطیت پسند نہیں تھے، ان کو پورا یقین تھا کہ اگر عوام کو صاف ستھری حکومت کے اصول وضوابط سے آگاہ کرا دیا جائے تو یقیناً ان کے غموں کا مداوا کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بقول ـــ ہم جنھیں مہذب ملک کہتے ہیں وہاں کے اکثر عوام غریبی، مفلسی اور کمزور حالت میں رہتے ہیں۔

تھامس پین نے اپنے بچپن میں چھوٹے چھوٹے معاملوں میں ملوث لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھانسی پر لٹکتے ہوئے دیکھا۔ اسی لیے انھوں نے سوال کیا۔ 'کیا سبب ہے کہ غریبوں کے سوا شاید ہی کسی اور کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے؟' یہی وجہ ہے کہ تھامس پین شاہی نظام کے سخت مخالف تھے۔ وہ ملک کی عظمت کے لیے انسان دوست ہونا پہلی شرط تسلیم کرتے تھے۔

تھامس پین اس عہد میں پیدا ہوئے جب امریکہ میں بادشاہت اپنی آخری سانس لے رہی تھی اور جمہوریت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس عہد میں تھامس پین ایک ایسے امن پسند فلسفی تھے جو مستقبل میں جمہوریت کے خواب دیکھتے تھے۔ امریکہ میں فلسفیوں اور مفکرین کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا اور انھیں شاید ہی کبھی اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ تھامس پین کو بھی امریکہ نے نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ ان کے ساتھ اہانت آمیز رویہ بھی روا رکھا گیا۔ تھامس پین ایک انقلابی شخص تھے اور اپنے جذبات کا اظہار عوامی زبان میں کرتے تھے جو امریکہ کے لیے پریشانی کا باعث بنا۔ یہی وجہ تھی کہ امریکہ نے انھیں ملک بدر کر دیا، اس کے باوجود تھامس پین امریکہ کو ہی اپنا ملک مانتے رہے اور انھوں نے یہیں پر جمہوریت کی بنیاد رکھی۔

ان کی مشہور و معروف کتاب ـــ 'کامن سینس' 1776 میں پہلی بار شائع ہوئی جس نے نظام حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے مطابق ہماری ضروریات سماج کو جنم دیتی ہیں اور ہماری بدعنوانیاں سرکار کو۔ سماج محبت کا رشتہ قائم کر کے ہماری خوشیوں میں اضافہ کرتا ہے اور سرکار ہماری بدعنوانیوں پر قدغن لگا کر خوشیوں کے اضافے میں معاون ہوتی ہے۔ سماج باہمی میل جول کو بڑھاوا دیتا ہے جب کہ سرکار تفرقہ پیدا کرتی ہے۔ سماج ہر صورت میں نعمت ہے، اس کے برعکس سرکار اپنی اصل صورت میں ایک لازمی برائی ہے، کیونکہ اگر ہم کسی سرکار کے ذریعے ان پریشانیوں کو جھیلیں جنھیں کسی اندھیر نگری چوپٹ راج میں جھیلنے کی امید کرتے ہیں، تو یہ سوچ کر ہماری پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ ہم خود ان تکالیف کے ذمے دار ہیں۔ اگر ہم اپنے ضمیر کی آواز سنتے اور اس کا استعمال کرتے تو ہمیں دیگر کسی قاعدے اور قوانین کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

''کامن سینس'' کی کامیابی نے تھامس پین کو بھی حیرت زدہ کر دیا، اگرچہ تھامس پین کی کسی بھی سیاسی جماعت سے وابستگی نہیں تھی، پھر بھی 1780 میں انھوں نے مملکتوں کے حقوق کے خلاف وفاقی نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ تھامس پین نے اٹھارھویں صدی میں جو لکھا وہ آج ہندوستان پر صادق آرہا ہے۔ اگرچہ جمہوریت کی وہ شکل یہاں موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے عناصر ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ تھامس پین کے نظریات کو ہندوستانی تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ جمہوریت کو حیات جاوداں بخشتے ہیں۔

92-1791 میں تھامس پین نے اپنی تصنیف ''انسانی حقوق'' کو دو حصوں میں شائع کیا۔ ان کی یہ تصنیف بطور خاص فرانس اور انگلینڈ کی سیاست سے متعلق ہے۔ انھوں نے یہ کتاب انقلاب فرانس سے ناراض و پریشان ہو کر قلم بند کی تھی۔ اگر تھامس پین کو امریکہ میں سیاسی تجربات کے بارہ برسوں جہاں انھوں نے انقلاب کے دوران اور اس کے بعد بھی مختلف صعوبتوں کے باوجود نہایت لگن کے ساتھ کام کیا، اس کی قوت حاصل نہ ہوتی تو ممکن ہے وہ دنیا کو یہ تصنیف نہیں دے پاتے۔ آج تھامس پین کو واشنگٹن سے کم درجے کا آدمی نہیں سمجھنا چاہیے، جس واشنگٹن نے انھیں قید خانے تک پہنچایا اس امریکہ کو انھوں نے جینے کا سلیقہ سکھا دیا۔ تھامس پین لکسمبرگ کے قید خانے میں مقید رہے۔ نمائندہ جمہوریت کے قیام پر غور و فکر کرتے وقت تھامس پین نے اپنے تجزیوں اور تجربوں کا سہارا لیا۔ تھامس پین کا خیال تھا کہ سلطنت کو چلانے

میں جو دولت خرچ ہوتی رہی، اس کا بہتر استعمال غریبوں کی معاشی طور پر اعانت کرنے میں خرچ ہوسکتا ہے۔ تھامس پین کے بقول— نہایت باضمیری کے احساس کے ساتھ عوامی دولت کو چھونا چاہیے کیونکہ نہ صرف امیروں بلکہ غریبوں نے اپنی محنت ومشقت کی بدولت یہ ذخیرہ جمع کیا ہے۔

آج ہندوستانی جمہوریت دوراہے پر کھڑی ہے۔ ایک طرف غریبی اور فاقہ کشی جیسے حالات ہیں تو دوسری جانب امیری اور کالا بازاری کی دھوم ہے اور اسی کے درمیان عام آدمی اپنے حقوق کے معانی تلاش کر رہا ہے، تھامس پین کو موجودہ دور کے متضاد سماج کے تناظر میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ ایک وسیع پس منظر میں زندگی کا فلسفہ پیش کرتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں تھامس پین نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انگلینڈ اور فرانس کی سیاست میں انھیں کسی طرح کا تعاون نہیں کرتا ہے، انھوں نے 1801 میں جیفرسن کے صدر منتخب ہونے پر شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا— میری لینڈ کے ذریعے اس وقت امریکہ آنا مجھے منظور نہیں ہے۔

دوسرے سال کے ماہ ستمبر میں تھامس پین بالٹی مور پہنچ گئے، لیکن واشنگٹن کے نام لکھے گئے خط'' دانشورانہ عہد'' نامی مضمون میں تنقید کے سبب امریکہ میں تھامس پین کی توہین بھی ہوئی۔

رابرٹ والٹن اور جان ویسلے کے گھر پر وہ پانچ مہینے رہے اور وہی ان کے سچے دوست ثابت ہوئے۔ جیفرسن کی حکومت میں پین کی سیاسی تصنیفات میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عوام سے متعلق لکھے گئے آٹھ عوامی خطوط کا انتخاب بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ جمہوری مقاصد کی تائید ونفاذ کے ذیل میں یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ لکسمبرگ میں اپنی قید اور واشنگٹن کی تنقید کرنے کے بعد تھامس پین کی حالت پہلے کی طرح نہیں رہی، جو ہمیشہ آزادی کی آواز بلند کرتا رہا اس کا انجام دردناک ہوا۔ اپنی ضعیف العمری میں وہ ایک بے وطن انسان ہوکر رہ گیا تھا۔ چڑچڑاہٹ اور خون کی کمی کے باعث تھامس پین نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی لیکن قابلیت وصلاحیت کے ساتھ ساتھ فطری طور پر رہنے والی انسانی کمزوریوں کے باوجود تھامس پین ان عظیم لوگوں میں سے ایک تھے جو اپنے عہد میں چاروں جانب روشنی پھیلا دیتے ہیں۔

□□□

(بہ شکریہ روزنامہ 'ہندوستان' نئی دہلی
5 دسمبر 2005)

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیاد گزار قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدرشناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے محققانہ انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت -/175 روپے

کلیاتِ سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جاسکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش وکوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں بسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیاتِ عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں، وہ غالب سے ان کی محبت ومودت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتب دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کرلیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ وہ دیگر اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آنے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہوگیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو حقہ میں سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک پر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110 066

رضوان احمد

ہندوستانی میڈیا کا بدلتا چہرہ

ایک نیوز چینل "سہارا سے" نے یوم خواتین کے موقعے پر صبح سات بجے سے لے کر شام کے پانچ بجے تک یعنی دس گھنٹوں تک صرف ایک ہی واقعہ دکھایا کہ جے پور کے ایک گھر میں اپنی ہی بہو اور بیٹے کے ہاتھوں 85 سالہ ضعیفہ پر روح فرسا ظلم ہو رہا ہے اسے گھر میں قید کر کے رکھا گیا ہے۔ اس سے صبح تا شام گھر کا کام کروایا جاتا ہے۔ صفائی کروائی جاتی ہے، کپڑے دھلوائے جاتے ہیں، برتن صاف کروائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ مار پیٹ بھی کی جاتی ہے۔ چینل کی نمائندہ نے چھپ کر تمام واقعات کی تصویریں لیں اور انھیں ٹیلی کاسٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد دنیا بھر کے ناظرین سے ان کی رائے طلب کی۔ سبھی نے اس کی مذمت کی۔ وہاں پولیس آگئی۔ خواتین کمیشن کی چیئرپرسن آگئیں، راجستھان کی گورنر اور وزیر اعلیٰ دونوں خاتون ہیں وہ بھی حرکت میں آگئیں۔ ضعیفہ کی بیٹی دہلی میں اور ایک بیٹا آگرہ میں تھا ان کی بھی رائے لی گئی۔ ظالم بہو کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔

ایک طرح سے نیوز چینل وکیل بھی بن گیا اور عدالت کا کمرہ بھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چینل کی اس مساعی سے ایک مظلوم ضعیفہ کو انصاف ملا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ یوم اطفال پر پیش آیا۔ ممبئی کے شقی القلب والدین اپنی نو سالہ معصوم بچی پر ظلم کر رہے تھے۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ ایک ان چاہی بچی تھی۔ ماں باپ اسے پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے اور وہ پیدا ہوگئی اس لیے انھوں نے اسے اسکول بھیجنے کی بجائے گھر کے کام کاج میں لگا دیا۔ اسے کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہیں دیتے تھے اور غسل خانے میں بند کر کے اسے وہیں سونے پر مجبور کرتے تھے۔ یہ المناک صورت حال پڑوسیوں نے دیکھی کہ وہ کس طرح گزرنے والوں سے کھانا اور مدد مانگتی ہے۔ ایک ہمدرد پولیس افسر نے اسے اس المناک صورت حال سے آزاد کروایا۔ اس پورے واقعے کو اسٹار نیوز نے اپنے کیمرے میں قید کیا اور نیوز چینل پر دکھایا۔ اس پر بحث بھی کروائی، ماہر نفسیات اور ماہر قانون کی رائے لی، وکیل اور پولیس افسر کی رائے لی۔ اس کے والد کو بھی ناظرین سے روبرو کروایا۔ اسے دیکھ کر بچی کے نانا نانی بھی آگئے اور ملک بھر میں کئی ایسے ہمدرد سامنے آئے جنھوں نے اس معصوم بچی کو گود لینے کی خواہش ظاہر کی۔ اس طرح نو سال کی ایک معصوم بچی کی پریشان حالی ناظرین کے سامنے آسکی۔

یہ دونوں واقعات اہم ہیں۔ ہمارے سماج میں جو ماں باپ کا درجہ تھا ہم انھیں نہیں دے رہے ہیں۔ میڈیا نے ایک بڑا اہم فریضہ ادا کیا کہ ایک ضعیفہ کے بچوں کو یہ احساس دلایا کہ اپنی بوڑھی والدہ کے تئیں ان کا کیا فرض ہے اور اگر بہو ظلم بھی کرتی ہے تو انھیں کیا کرنا چاہیے۔ اسی طرح ایک ایسی بچی جسے اس کے والدین پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ پہلے سے ہی ان کے پاس ایک بیٹی اور بیٹا موجود تھا، وہ اسے نہ صرف نظر انداز کرتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ وہ زندہ نہ رہے۔ اس کے تئیں میڈیا سماج کو احساس دلاتا ہے کہ اپنی نو سالہ معصوم بچی کے تئیں ان کا کیا فرض ہے۔

اس کے علاوہ ایک وہ واقعہ ہے جس میں دکھایا گیا کہ کانپور میں دو سیاسی رہنماؤں کے استقبال کے لیے اسکول کے ننھے منے بچے لے جائے گئے۔ ان کو دھوپ میں گھنٹوں بھوکا پیاسا چھوڑ دیا گیا اور دھوپ و گرمی کی شدت سے پچاس بچے بیہوش ہوگئے جنھیں اسپتال لے جانا پڑا۔ میڈیا کے ذریعے یہ واقعات دکھائے جانے کے بعد ان دونوں سیاسی رہنماؤں نے معذرت کی۔

ایسا ہی واقعہ ایک چینل نے دکھایا کہ گجرات کے کچھ علاقے میں ایک عاشق نے اپنی محبوبہ کو سنسان علاقے میں لے جا کر اس کے اوپر کار چڑھا دی اور وہاں سے بھاگ گیا مگر اتفاق سے لڑکی بچ گئی اور اس نے اپنی درد بھری داستان میڈیا کو سنائی جس کے بعد اس ظالم عاشق پر پولیس نے شکنجہ کسا اور اسے کیفر کردار تک پہنچایا گیا۔

ایک چینل نے لکھیم پور کھیری میں پٹرول میں ملاوٹ کی خفیہ تصویریں لیں مگر جس پٹرول پمپ پر یہ سلسلہ جاری تھا اس نے اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے پٹرولیم افسر کا ہی قتل کروادیا لیکن اس جرم کے بعد اسے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک نیوز چینل نے نقلی دودھ بنا کر بیچنے کا سلسلہ وار آئٹم دکھایا جس کا خاطر خواہ اثر یہ ہوا کہ خاطی پکڑے گئے۔

ایسا نہیں ہے کہ پرنٹ میڈیا یہ فریضہ انجام نہیں دیتا تھا لیکن پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں فرق یہ ہے کہ اخبارات میں خبریں یا رپورٹیں شائع ہونے کے بعد کارروائی ہونے میں وقت لگتا ہے جبکہ الیکٹرانک میڈیا براہ

راست میڈیا ہے۔ کسی خبر کو ٹی وی یا انٹرنیٹ پر دکھائے جانے کے فوراً بعد ہی اس کا اثر نمایاں ہونا شروع ہوجاتا ہے جیسا کہ مذکورہ واقعات کے سلسلے میں ہوا۔ اخبار پڑھنے کے لیے زبان کی جانکاری ضروری ہے اور اس کا سماج پر اثر اس طور پر مرتب نہیں ہوتا ہے اس لیے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے قارئین اخبار یا اس کی مخصوص خبر یا رپورٹ کا مطالعہ بیک وقت نہیں کرتے جبکہ الیکٹرانک میڈیا پر دکھائی جانے والی خبر ایک ہی وقت میں پورا ملک یا جہاں تک اس کی رسائی ہو دیکھی جاتی ہے۔ اس کا اثر فوراً ظاہر ہوتا ہے جبکہ اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹ کے اثرات دیر میں سامنے آتے ہیں۔

حالانکہ ایک چینل کے ذریعے گجرات کے مندر میں سادھوؤں کے ذریعے جنسی استحصال کے مناظر دکھائے جانے یا پھر بہار کے تین سیاست دانوں کے ذریعے لڑکیوں کا جنسی استحصال کرنے اور پھر فلمی اداکاروں کے ذریعے دو شیزاؤں کا جنسی استحصال کے جو مناظر دکھائے گئے ان پر کافی تنازعہ ہوا۔ چینل کے ایڈیٹر رجت شرما جنھوں نے اسے اسٹنگ آپریشن کا نام دیا ان کا خیال ہے:

"ہمارا ماننا ہے کہ اگر ہمارے سماج میں بدعنوانی ہے، بے ایمانی ہے جنسی استحصال ہے تو اس کا پردہ فاش ہونا چاہیے۔ یہ پردہ فاش کرنے کی ذمے داری کس کی ہے؟ صحافتی اداروں پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کا پردہ فاش کریں اور حقیقی صورت حال سماج کے روبہ رو پیش کریں چاہے فلمی دنیا ہو یا مذہبی ادارے یا سیاسی میدان، سبھی سماج کا حصہ ہیں۔ کسی کو الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا اور نہ کوئی اتنا پارسا ہے کہ اس پر انگلی نہ اٹھائی جاسکے"

(روزنامہ "ہندوستان" 20 مارچ 2005)

مگر میڈیا کے ایک اور ماہر ترون تیج پال جنھوں نے ایک سیاست داں کو رشوت لے کر روپے گنتے دکھایا تھا وہ رجت شرما سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے مطابق "صحافت ایک بہت بڑی بندوق ہے۔ صحافیوں کے ہاتھوں میں مہلک ہتھیار ہوتا ہے لیکن اس بندوق کے ساتھ بہت بڑی ذمے داری اور جواب دہی ہے۔ آپ اس کا من مانا استعمال نہیں کرسکتے، اس کا استعمال فلاح کے لیے کیا جانا چاہیے، معمولی اور شخصی واقعے کے لیے نہیں۔"

(روزنامہ "ہندوستان" 20 اپریل 2005)

چونکہ ہمارے ملک میں میڈیا کی مسلسل توسیع ہورہی ہے، ایسے میں اس کا یہ نیا چہرہ سامنے آگیا ہے۔ ایک طرح سے یہ ایک نیا تجربہ ہے مگر ہمیں یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے مثبت اثرات نمایاں ہوئے ہیں اور متاثرین کو انصاف ملا ہے۔

□□□

Arisha, Old Traders Lane,
Darzi Tola, P.O. Bankipur,
Patna-800 004.

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اوّل، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے
جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت. تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا.

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

جاوید ندیم

نشتر خانقاہی

حادثوں سے مختلف اک حادثہ لکھنا مجھے

''میں یہاں عورتوں کے چہرے دیکھنے کے لیے بیٹھتا ہوں یا تمھاری غزلیں؟''

......پھر شاہ ظہیر سے مخاطب ہوئے۔ ''ارے یار! اپنے دوست کو سمجھاؤ۔ کیا میں یہاں لوگوں کی غزلیں دیکھنے کے لیے آتا ہوں؟''

یہ الفاظ تھے نشتر خانقاہی کے، میری اس گذارش کے جواب میں، جو میں نے اپنی غزل بہ غرضِ اصلاح ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کی تھی۔ اس خلاف توقع جواب سے میں دَم بخود سا رہ گیا۔ قدرے خوف زدہ بھی۔ غزل لکھا کاغذ کب میری جیب میں واپس آیا مجھے یاد نہیں۔

وہ 1978 کی اپریل یا مئی کی کوئی شام تھی۔ چلچلاتی دھوپ اور گرمی کی شدت ماند پڑ چکی تھی، سڑکوں پہ لوگوں کی چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ رام کے چوراہے پر شاہ ظہیر کی دوکان کے سامنے ہم لوگ معمول کے مطابق بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت شاہ ظہیر، نشتر صاحب اور میرے علاوہ کوئی نہ تھا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور مذکورہ بالا گذارش کر ڈالی۔ مگر اس کے بعد جو دھماکہ ہوا، شام کی خنکی بادِ سموم میں بدل گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے سورج نصف النہار پر ہے اور میں گرم لوؤں کے جھکڑوں میں گھرا ہوں، اس کے بعد وہاں کون آیا اور کون گیا، کیا باتیں ہوئیں، مجھے کچھ پتا نہیں۔ شدید صدمے سے میں دیکھنے اور سننے سے جیسے محروم سا ہو گیا تھا۔

پرائمری اسکول کے بعد جب میں ہائی اسکول میں داخل ہوا تو یہاں اسکول لائبریری میں ڈھیروں کتابیں نظر آئیں۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر جعفر سعید مرحوم بڑے عالم، فاضل اور اعلیٰ پائے کا ادبی ذوق رکھنے والے شخص تھے۔ اسکول لائبریری کے لیے وہ کئی رسائل منگوایا کرتے تھے، جن میں تحریک، ہماری زبان، پیامِ تعلیم، ہدیٰ، ہما، نئی دنیا، آج کل اور نیا دَور وغیرہ شامل تھے۔ مجھے کھیل کود کا شوق تو تھا نہیں، مگر کتابوں میں بہت دلچسپی تھی، اپنا فاضل وقت میں کتب و رسائل کے مطالعے میں ہی گذارتا۔ نشتر خانقاہی کا نام میری نظر میں پہلی بار ایسے ہی کسی رسالے سے آیا تھا۔ کچھ رسائل میں ان کی شاعری پر تنقیدی و توصیفی خطوط و مباحث بھی نظر سے گذرے۔ ایک بار (شاید 1974 کی بات ہے) ماہ نامہ ''روبی'' میں ان کی غزل چھپی تھی اور پتہ لکھا تھا، محلہ کھاتان، بجنور، یو. پی.۔ پڑھ کر مجھے حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ خود سے کہا۔ ''یہ تو میرے ہم وطن ہیں۔'' اس کے بعد ان کا نام جہاں بھی دیکھتا، ان کے کلام کو اشتیاق سے پڑھتا اور سوچا کرتا کہ بجنور جاؤں گا تو نشتر خانقاہی سے ضرور ملوں گا۔

ایک بار ریلوے کے بک اسٹال سے ایک ماہنامہ خریدا۔ 'سو برس' نام تھا۔ ورق پلٹا، مدیر کی حیثیت سے نشتر خانقاہی کا نام لکھا تھا۔ بڑا خوب صورت رسالہ تھا، جو چند شماروں کے بعد بک اسٹال پر نظر نہ آیا۔ مگر نشتر خانقاہی کی مدیرانہ صلاحیتوں کا عکس ذہنوں پر چھوڑ گیا۔

1975 میں والد صاحب نے پنویل سے اپنا کاروبار سمیٹا اور ہم لوگ اپنے وطن بجنور چلے آئے۔ میرے ماموں ہریانہ میں ٹھیکے داری کیا کرتے تھے۔ انھوں نے میرا داخلہ روہتک کے گوڑ کالج میں کروا دیا کہ وہاں کے پرنسپل ان کے دوست تھے۔ چھٹیوں میں بجنور آیا کرتا تھا۔ رشتے داروں کے علاوہ کسی سے شناسائی نہ تھی کہ اب تک کی زندگی تو ممبئی (پنویل) میں گذری تھی۔ نشتر خانقاہی سے کیسے ملا جائے، بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے رشتے داروں میں کوئی بھی شعر و ادب کا ذوق نہ رکھتا تھا کہ اس سے نشتر خانقاہی کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔

مختصر تعارف

نام	:	سید انور حسین
قلمی نام	:	نشتر خانقاہی
ولدیت	:	سید محمد حسن
ولادت	:	1930 بمقام جہان آباد، ضلع بجنور، یو. پی.
تعلیم	:	انٹر میڈیٹ، مسلم انٹر کالج، بجنور

اردو شعری مجموعے

میرے لہو کی آگ

دسترس

سرائے میں شام

منظر، پس منظر

معلوم، نا معلوم

لہو روشن ہوا

ایک بار نشتر صاحب کی کتاب ''میرے لہو کی آگ'' ایک کتب فروش کی دکان پر نظر آئی۔ قیمت تھی چالیس روپے۔ میری جیب اس وقت اس کی متحمل نہیں تھی، بعد میں خریدی گئی۔ کتاب پڑھی اور ایک نئے انداز کی شاعری سے سابقہ پڑا تو محسوس ہوا کہ یہ چیز دوسروں سے مختلف ہے اور اس شاعر سے ضرور ملنا چاہیے۔

اس دوران میں اپنی اردو نظمیں دیوناگری لپی میں لکھ کر یہاں کے مقامی اخبارات میں دینے لگا کہ اس وقت یہاں بجنور سے کوئی بھی اردو اخبار نہیں نکلتا تھا۔ نظمیں چھپنے لگیں اور یہاں کا ادبی حلقہ متوجہ ہوا کہ ''یہ راز بجنوری'' کون ہے؟ (اس وقت میں یہی تخلص رکھتا تھا) کوئی مجھے جانتا نہیں تھا، کوئی مجھ سے ملا نہیں تھا۔ ایک شام میں ہندی ہفت روزہ ''پرساد کے پھول'' کے دفتر اپنی تخلیقات لے کر پہنچا۔ وہاں ہندی کے کئی کوی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ''پرساد کے پھول'' کے مدیر جے۔ نارائن ارُون نے کہا:

''یہی ہیں راج (راز) بجنوری جی۔''

''اچھا تو آپ ہیں راز صاحب! بیٹھیے۔'' کوی حقہ بجنوری نے کہا: ''بھئی! اچھی کویتائیں کہتے ہیں آپ، مَو لِکتا ہوتی ہے ان میں۔''

''شکریہ!'' میں نے کہا۔ یہ پہلا موقع تھا میرا بجنور کے ادبی لوگوں سے ملنے کا۔ بعد کو مجھے تنظیم ''ساہتیہ سنگم'' کا رکن بنا لیا گیا۔ ساہتیہ سنگم کی ماہانہ نشست ہوا کرتی تھی، جس میں اردو، ہندی کے شعرا اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے۔ میں تنظیم کی ہر نشست میں شامل ہوتا اور یہ امید کیا کرتا کہ شاید نشتر خانقاہی سے کسی نشست میں ملاقات ہو جائے۔ ہر نشست میں کوئی نہ کوئی نیا شاعر اور کوی آتا مگر نشتر صاحب نہ آتے۔ ایک روز میں نے جے۔ نارائن اردن سے پوچھا: ''کیا آپ لوگ نشتر خانقاہی صاحب کو دعوت نہیں دیتے؟''

''وہ بڑے شاعر ہیں، ہماری گوشٹھیوں میں نہیں آتے۔'' اردن نے کہا تھا۔ میں نا امید ہو گیا۔..... وقت گذرتا گیا ..... ایک روز ایک مشاعرے میں جو آریہ سماج، بجنور نے سوامی وویکانند کے یوم پیدائش پر رکھا تھا، شاہ ظہیر سے ملاقات ہوئی، جو کبھی بجنور سے ہفت روزہ ''حرارت'' نکالا کرتے تھے۔ یہ ملاقات بعد کو دوستی میں بدل گئی۔ شاہ ظہیر اس وقت نشتر صاحب کے کافی قریب تھے۔ ہفت روزہ ''حرارت'' جو بند ہو چکا تھا، شاہ ظہیر کے ساتھ مل کر میں نے اس کی اشاعت دوبارہ شروع کروائی۔ ''حرارت'' کے اداریے نشتر صاحب لکھا کرتے تھے کہ اس وقت Current Topic پر لکھنے کی استطاعت شاہ ظہیر میں تھی نہ مجھ میں۔ جب کہ نشتر صاحب کسی بھی موضوع پر پندرہ بیس منٹ میں اداریہ لکھ دیا کرتے تھے۔

یہ بھی بتا دوں کہ میں راز بجنوری سے جاوید ندیم کیسے ہوا۔ بات دراصل یوں ہے کہ ہندی والوں کی اکثریت راز کا تلفظ راج کرتی تھی، جو مجھے بہت گراں گزرتا۔ جس وقت ہفت روزہ ''حرارت'' کو دوبارہ شروع کرنے کا منصوبہ چل رہا تھا، جس میں میرا نام معاون مدیر کی حیثیت سے آتا تھا، میں نے سوچا تخلص تبدیل کر لیا جائے اور کوئی ایسا نام رکھا جائے جسے ہر کس و ناکس بغیر کسی زحمت کے درست ادا کر سکے۔ بہت سے نام سوچے گئے، مگر قرعۂ فال ''جاوید ندیم'' کے نام نکلا۔

میں نے نشتر صاحب کی تصویر دیکھی تھی اور شاہ ظہیر سے ان کا حلیہ بھی معلوم ہو گیا تھا۔ وہ منظر آج بھی میرے ذہن میں کسی تازہ فلمی منظر کی طرح محفوظ ہے، جب ایک شام میں نے سبزی منڈی میں سفید کرتا، پائجامہ میں ملبوس، کمر خمیدہ، آنکھوں پر عینک لگائے تیز قدموں سے چلتے ہوئے شخص کو دیکھا تھا۔ میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں کہ وہ شخص نشتر خانقاہی تھے۔ میں اپنی جگہ ٹھہر گیا اور احترام بھری نظروں سے انھیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے جدید اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی نگاہیں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ گویا راہ میں بکھرے زندگی کے تجربوں کو

ہندی تصنیفات و تالیفات

موم کی بیساکھیاں	(غزلیں، ہندی رسم الخط میں)
دنگے کیوں اور کیسے	(فسادات پر تحقیقی کام)
وشو آتنک واد	(عالمی دہشت گردی کی تاریخ)
مانو ادھیکار...... دشا اور آشا	(حقوق انسانی کا معروضی جائزہ)
ناری، کل اور آج	(خواتین سے متعلق ایک تجزیاتی مطالعہ)
کیسے کیسے لوگ ملے	(خاکے)
غزل میں نے چھیڑی	(ہندی غزلیں)
دھکّی بازی کے یگ میں	(طنزیہ مضامین)
غزلوں کے شہر میں	(اردو غزلوں کا انتخاب)
میرے گیارہ ناٹک	(ڈراموں کا مجموعہ)
پریاورَن	(ماحولیات پر معلوماتی کتاب)
غزل اور اس کا ویاکرن	(عروض پر بنیادی معلومات)

ادارت

ماہنامہ ''شاہ راہ''، دہلی

ماہنامہ ''مشاہدہ''، دہلی

ماہنامہ ''سویرس''، دہلی

روزنامہ ''شمع جدید''، بجنور

سمیٹتے جا رہے ہوں۔ رفتار تیز تھی، گویا وقت کا دامن پکڑے چل رہے ہوں یا پھر یہ ڈر کہ کہیں وقت آگے نہ نکل جائے۔ وہ تیز رفتاری جو مجھے ان کے 'پُرعزم روش' میں نظر آئی تھی، ان کی شاعری میں شدید تر نظر آئی۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے عہد سے آگے کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں عصرِ حاضر کی جتنی جھلک ہے، اس سے زیادہ آنے والے عہد کی گونج؛ اور اس کا احساس خود انھیں بھی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید وہ یہ کبھی نہ کہتے۔

تم کتابوں میں محفوظ کرلو مجھے، کیا عجب کل کوئی پڑھنے والا ملے
میں وہ آواز ہوں جس کا سامع نہیں، میں وہ لہجہ ہوں جو ناشنیدہ رہا

وہ شاید 1978 کے اختتامی ایک دو مہینوں کی کوئی شام تھی۔ رام کے چوراہے پر واقع شاہ ظہیر کی دوکان کے سامنے دیگر دو تین لوگوں کے ساتھ نشتر صاحب موڑھے پر تشریف فرما تھے۔ سب اس طرح خاموش تھے جیسے کسی میت والے گھر کے سامنے بیٹھے ہوں۔ نہ کوئی گفتگو نہ کلام، گویا کسی گہرے صدمے سے دوچار ہوں۔ میں سائیکل پر سوار وہاں پہنچا۔ شاہ ظہیر نے اُٹھ کر دکان سے میرے لیے اسٹول نکالا، میں نے سلام کیا اور بیٹھ گیا۔

''یہ ہیں ''حرارت'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور ہمارے دوست جاوید ندیم صاحب......! اور آپ نشتر خانقاہی صاحب ہیں۔'' شاہ ظہیر نے تعارف کرایا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔'' غائبانہ تعارف تو آپ سے تھا ہی، خوش قسمتی سے آج ملاقات بھی ہوگئی۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

''مگر مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی!'' نشتر صاحب نے بڑے روکھے لہجے میں کہا اور میری خوشی کے جلتے چراغوں پر پانی ڈال دیا، مزید گویا ہوئے۔''جب دو اجنبی ملتے ہیں تو ایسا کیوں کہتے ہیں؟ جب کہ اس سے قبل وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں، انھیں ایک دوسرے سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوتی، وہ جھوٹ بولتے ہیں، میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

خلافِ توقع جواب سے میں بوکھلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ میں نے خود کو سنبھالا اور اپنی بوکھلاہٹ چھپاتے ہوئے کہا: ''لیکن مجھے آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' ان کا جواب تھا اور پھر وہی گمبھیر خاموشی، گویا کسی میت والے گھر کے سامنے بیٹھے ہوں۔

شام کے وقت شاہ ظہیر کی دکان پر جانا میرا روز کا معمول بن گیا تھا۔ نشتر صاحب بھی وہاں پابندی سے آیا کرتے تھے۔ وہ بہت کم بولتے تھے اور میں تقریباً خاموش ہی رہتا۔ ایک روز خود ہی کہنے لگے۔''شعر کہتے ہیں آپ؟ کچھ سنائیں۔''

''بس تک بندی کر لیتا ہوں۔''

''وہی سنا دیجیے۔'' انھوں نے سپاٹ اور روکھے لہجے میں کہا، جس سے میں نے اپنے اندر ایک قسم کا بکھراؤ سا محسوس کیا۔ میں نے خود کو سمیٹا اور غزل کے کچھ اشعار سنانے لگا۔ وہ مسلسل زمین کو تک رہے تھے اور میں ان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، جس پر کوئی تاثر تھا نہ جذبہ۔ اشعار سننے کے بعد انھوں نے صرف اتنا کہا۔'' اچھا!'' اور پھر خاموشی کی مورت بن گئے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ انھیں میرے اشعار پسند نہیں آئے اور یہ بات میرے لیے افسوس ناک تھی۔

مذکورہ بالا واقعے کے کافی عرصہ بعد ایک روز معمول کے مطابق ہم لوگ شاہ ظہیر کی دکان پر بیٹھے تھے، جہاں ہم تینوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور جیب سے کاغذ نکالتے ہوئے نشتر صاحب سے بڑے ادب کے ساتھ گویا ہوا۔ نشتر صاحب ایک غزل کہی ہے۔ اگر آپ اصلاح فرما دیں تو...... میں اپنا جملہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ جوالامکھی پھٹ پڑا اور نشتر صاحب کے دہن سے وہ الفاظ نکلے، جن سے میں نے اپنی بات کی ابتدا کی ہے۔ نشتر خانقاہی سے ملنے سے پہلے میرے من میں ان کی جو پرتیما بنی تھی، وہ تو پہلی ملاقات میں ہی کھنڈت ہوگئی تھی، اس واقعے کے بعد وہ آس بھی دھراشائی ہوگئی، جو اپنی [illegible] کے کارن بچی ہوئی تھی۔ اور اب اس کی جگہ ان کے بارے میں ایک نئی کلپنا نے جنم لیا کہ یہ ایک مغرور اور منہ پھٹ قسم کا سنکی شخص ہے۔

آج نشتر صاحب کے تعلق سے ایسا سوچنا مجھے خلافِ ادب محسوس ہوتا ہے، مگر یہ سچ ہے کہ میں نے اس وقت ایسا ہی سوچا تھا اور سچ بولنے کا یہ حوصلہ بھی مجھے نشتر صاحب سے ہی ملا ہے کہ وہ لگی، لپٹی نہیں رکھتے جو محسوس کرتے ہیں، اس کا برملا اظہار کر دیتے ہیں اور سچ سے ان کا یہ Commitment ان کی نجی زندگی سے ادبی زندگی تک پھیلا ہوا ہے:

اب نہ وہ میں ہوں، نہ تم ہو، نہ وہ رشتہ باقی
یوں تو کہنے کو وہی ہوں میں تمہارا اپنا

مصلحت سے پاک اتنے حوصلے کے ساتھ سچائی کا اظہار ایک عام آدمی نہیں کرسکتا اور جب یہ سچ کسی فن کار کے فن میں شامل ہو تو مزید آبدار ہو کر فن کو بھی آبدار اور لازوال بنا دیتا ہے۔ سچ نشتر خانقاہی کی شاعری کا غالب وصف ہے۔

وقت خود کو پلوں سے دنوں اور ہفتوں میں بدلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ نشتر صاحب اس روز کچھ اچھے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے'' جاوید ندیم صاحب! کچھ سنایئے۔ کیا کہہ رہے ہیں آج کل؟''

مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے رسماً کہا۔" کچھ نہیں۔"

" کچھ تو کہا ہوگا، سنائیے۔"

میں خاموش رہا، کہنے لگے۔" ہاں، ہاں سنائیے۔"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا:" ایک جدید انداز کی غزل کہی ہے۔"

انھوں نے" ہوں" کہہ کر گردن ہلائی اور میں نے غزل کا مطلع پڑھا:

سورج کی بستیوں میں تماشا لیے ہوئے
کب سے کھڑا ہوں دھوپ میں شیشہ لیے ہوئے

مطلع سنتے ہی انھوں نے پہلو بدلا اور میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا:" پھر پڑھو!" میں نے مطلع دہرایا، کہنے لگے:

" میں تو سمجھتا تھا، تم بالکل ڈفر ہو، مگر تم میں تو شعر کہنے کی صلاحیت ہے۔ اور سناؤ!"

میری جان میں جان آئی اور میں نے پوری غزل سنادی۔ غزل سن کر شاہ ظہیر سے کہنے لگے:

" میاں شاہ ظہیر! تمھارا دوست تو شعر کہہ سکتا ہے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔" اس غزل کو لکھ کر مجھے دینا، میں ٹھیک کردوں گا۔"

نشتر صاحب کے اس تبدیل شدہ رویے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ مجھے اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ انھیں میرے اشعار پسند آئے۔ میں ان کے چہرے پر بھی حیرت آمیز مسرت دیکھ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب میں نے اس چہرے پر جذبات و تاثرات دیکھے تھے، جو نشتر خانقاہی کا فوٹو بنا پھرتا تھا۔ اس وقت مجھے لگا تھا کہ اس فوٹو میں حرکت پیدا ہوئی ہے اور وہ ایک زندہ چہرے میں تبدیل ہوگیا ہے۔

نشتر صاحب محلہ بھاٹان کے کرایے کے مکان میں سکونت پذیر تھے، مکان کی اوپری منزل پر ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ نشتر صاحب اسی میں قیام فرما رہتے اور نچلے کمرے میں ان کے اہل خانہ۔ صحن کا احاطہ کرنے والی دیوار میں دو دروازے تھے۔ ایک سیدھا صحن میں کھلتا تھا، دوسرا اوپری منزل کے زینے کے پاس تھا۔ جہاں سے ملنے ملانے والے آیا جایا کرتے تھے۔ یعنی ایک دروازہ زنانے کا اور دوسرا مردانے کا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے۔ میں نشتر صاحب کے یہاں گیا۔ مردانے والے دروازے پر دستک دی۔ آواز آئی " کون؟" میں نے کہا" جاوید" آواز آئی" ٹھہرو" میں ٹھہر گیا۔ ادھر اوپر دور چل رہا تھا۔ نشتر صاحب کے کہنے پر۔ سارے گلاس اور بوتلیں چھپا دی گئیں۔ شاہ ظہیر نے کہا:" جاوید کو معلوم ہے کہ آپ پیتے ہیں۔" نشتر صاحب نے کہا: " بات دراصل یہ ہے کہ میں اس بچے کا بہت احترام کرتا ہوں۔" شاہ ظہیر نے جب مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں نے سوچا، وہ شخص جس کا ایک زمانہ احترام کرتا ہے وہ مجھ ایسے حقیر و کم مایہ کے تعلق سے ایسے خیالات رکھتا ہے۔ یہ بات میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ نشتر خانقاہی کی وہ پرتما جو عرصہ پہلے کھنڈت ہوکر دھراشائی ہوگئی تھی، اس کے کھنڈ آپس میں جڑنے لگے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد بھی ایسا کئی بار ہوا کہ میں بے موقع پہنچ گیا اور دور، تھم گیا، گلاس، بوتلیں چھپا دی گئیں۔ ایک بار میں نے خود دیکھا کہ ایک نصف بھرا گلاس چوبی کرسی کے پائے سے جھانک کر مجھے دیکھ رہا ہے کہ دیکھیں تو کون ہے یہ شخص، جس کے آتے ہی ہمیں پردے میں چلے جانے کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

میں اگر کبھی ایک دو روز نشتر صاحب سے نہ ملتا، وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتے۔ میرے قیام پوڑی گڑھوال کے دوران لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

" آپ کی موجودگی سے عجیب ایک ڈھارس اور ہمت سی رہتی ہے۔ پوڑی بھی چونکہ زیادہ دور نہیں اس لیے مجھے اکثر یہ احساس رہتا ہے کہ آپ مجھ سے قریب ہیں۔ جب ضرورت ہو آپ کو بلایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے آپ نے بمبئی جانے کا پروگرام بنایا ہے، میں اندر ہی اندر ایک خلا سا محسوس کرنے لگا ہوں اگر چہ اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ بہر حال آپ جہاں رہیں، خوش رہیں۔ یہی میری تمنا ہے۔" (29 ستمبر 1980)

انھی دنوں کی بات ہے جب نشتر صاحب کے یہاں میرا آنا جانا شروع ہی ہوا تھا اور وہ میری شاعری پر اصلاح دینے لگے تھے۔ ایک روز انھوں نے اصلاح شدہ غزل کا کاغذ مجھے دیتے ہوئے کہا:

" لو یہ تمھاری غزل، ٹھیک کردی ہے۔" کاغذ لے کر میں پڑھنے لگا۔ میں نے پایا کہ اس میں ایک شعر زائد ہے۔ میں نے نشتر صاحب سے کہا کہ یہ شعر تو میں نے نہیں کہا تھا۔

" ہاں، میں غزل دیکھ رہا تھا تو یہ شعر بحر میں آگیا، میں نے لکھ دیا۔"

میرے وجود میں ملال کی ایک لہر دوڑ گئی کہ شاید نشتر صاحب نے مجھے بھی ان شاعروں کی طرح سمجھا ہو جو اصلاح کے نام پر ان سے پوری کی پوری غزل لکھوا لے جاتے ہیں۔ میں کچھ دیر خاموش رہا، پھر دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔" لیکن...... میں اسے اپنا شعر تو نہیں کہہ سکتا؟" نشتر صاحب نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں اور بہت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا:" چاہو تو رکھ لو...... ورنہ، کاٹ دو۔" اسی شام جب وہ رام کے چوراہے پر شاہ ظہیر سے ملے۔ کہنے لگے:" یار! تمھارا دوست جاوید ندیم بڑا خوددار لڑکا ہے۔" اس روز کے بعد سے میں نے پایا کہ انھوں نے میری غزلوں میں ایک آدھ لفظ کے اضافے یا الفاظ کی ترتیب کی تبدیلی کے علاوہ شاید ہی پورا مصرع

بدلا ہو۔ جہاں ایسی ضرورت محسوس کرتے، نوٹ لگا دیتے۔ ''یہ مصرع دوبارہ کہو یا یہ شعر دوبارہ لکھو۔''

نشتر صاحب ہر روز صبح چار بجے سو کر اٹھتے ہیں اور لکھنے لکھانے کا کام اسی وقت کرتے ہیں۔ پھر دن بھر ان کے یہاں ملنے ملانے والوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے اور رات نو بجے تک وہ سو جاتے ہیں۔ جلدی سونے کی عادت کے سبب ہی وہ رات میں کہیں آتے جاتے نہیں۔ اپنے اس اصول کو انھوں نے صرف میرے لیے ہی توڑا اور ان نشستوں میں شرکت کر کے اہل بجنور کو حیرت میں ڈال دیا، جو میرے اعزاز میں رکھی گئی تھیں۔ ایسا چار بار ہوا۔ یعنی جب جب میں بمبئی سے بجنور گیا، بجنور کے احباب نے اعزازی نشستوں کا اہتمام کیا اور نشتر صاحب نے ان میں شرکت کی۔

میرے پہلے مجموعے ''پنچھی رخصت ہوئے'' کی فائل تیار ہوئی، میں بجنور پہنچا۔ نشتر صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ ''اسے دیکھ لیجیے۔ جو اشعار کاٹنے ہوں، کاٹ دیجیے، جنھیں درست کرنا ہو، درست کر دیجیے اور جیسا محسوس کریں اپنی رائے لکھ دیجیے۔'' میں آٹھ دن کے رٹرن ٹکٹ پر بجنور گیا تھا۔ تین دن ہو چکے تھے۔ فائل ویسی ہی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''فائل دیکھی آپ نے؟'' کہا ''ہاں دیکھ لوں گا۔'' چوتھے روز صبح جب میں ان کے یہاں پہنچا۔ دیکھا فائل ان کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ ''مجھے حیرت ہے تم نے اپنے آپ کو میرے اثر سے کیسے محفوظ رکھا؟'' مجھے ان کے جملے سے بے حد خوشی ہوئی۔

اسی روز شام کو میں دوبارہ نشتر صاحب سے ملنے گیا۔ ''لو یہ رہی تمھاری فائل۔ میں نے دیکھ لی ہے۔ جہاں ضرورت تھی اصلاح دے دی ہے۔ کچھ غزلیں اور اشعار کاٹ دیے ہیں، اب یہ بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔''

اگلے دن میں ان کے گھر پہنچا۔ میرے ہاتھ میں مضمون تھما دیا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ اتنی جلدی مضمون بھی لکھ دیا، جب کہ مجھے ایک غزل کہنے میں ہفتوں لگ جاتے ہیں۔

نشتر صاحب کی نثر اور نظم اس قدر چست اور رواں ہے کہ قاری اس کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ الفاظ کا برمحل اور موزوں استعمال، لفظوں کی ترتیب و انتخاب ایسا کہ کسی لفظ کو ہٹا کر اگر آپ کوئی دوسرا لفظ رکھنا چاہیں تو جھول آجائے۔ نئے الفاظ و تراکیب جس تعداد میں نشتر صاحب کے یہاں ملیں گے، ہم عصروں میں شاید ہی کسی کے یہاں ہوں۔ ان کی شاعری میں موضوعات کی بہتات اور رنگارنگی بھی انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ الفاظ ان کے یہاں محض خارجی صورت حال کو بیان کرنے کا وسیلہ نہیں بلکہ ظاہر سے باطن میں جانے کا ذریعہ بھی ہیں۔ وہ لفظوں سے ایسے پیکر تراشتے ہیں، جو کیفیت حال کا اعلامیہ بن کر ایک اور ہی منظر کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ منظر جو انسان کے اندرون میں کھلتا ہے۔

نشتر صاحب کی پوری شاعری ظاہر سے باطن کا سفر ہے:

ذبح کرنے پڑے شہر بیدار میں جب بھی خوابوں کے جنگلی کبوتر مجھے
اپنے ہی خون میں صبح لتھڑا ملا، خوشبوؤں سے بھرا میرا بستر مجھے

یا

میں کہ سرجن کی ٹیبل پہ رکھا ہوا صرف اک جسم ہوں تجربہ گاہ میں
آج کی رات گذرے تو یہ چارہ گر کل لگا دیں گے فائل میں لکھ کر مجھے

نشتر صاحب نے آدمی کی ذہنی، قلبی کیفیات اور باطنی محسوسات کو اپنی شاعری میں اجاگر کرنے کی اپنی کوشش کو منزل تمام تک پہنچا دیا ہے۔ انسان کی اندرونی سچائی کی تلاش و جستجو ہی ان کی شاعری کا محرک اور مرکز ہے۔

وہ کہ اپنے نصف آخر تک ہے، اِک ذہن رَسا
جسم کی حد تک تو اس کو بھولنا ممکن نہ تھا
چھو کر مجھے نہ دیکھ کہ یہ میں نہیں ہوں دوست
اِک بار مجھ کو توڑ کہ میرا پتہ لگے

آج کے عہد کا آدمی زندگی کے تضادات سے نبرد آزما ہے۔ ایک طرف وہ اپنے سنسکاروں سے بندھا ہے، جہاں مذہبی و اخلاقی تقاضے اور ضابطے اسے اپنے خاندان اور سماج سے جوڑتے ہیں تو دوسری طرف مغربی تہذیب کی چکا چوند اور Consumerism کے پھیلتے ہوئے جال نے اسے بے حس اور خود غرض بنا دیا ہے اور وہ ان دونوں انتہاؤں کے بیچ سفر کرنے پر مجبور ہے۔

پانو آئندہ کی جانب، سرگذشتہ کی طرف
یوں بھی چلتے تھے مسافر، اِک سفر ایسا بھی تھا
حاصل مجھی کو کیا ہوا اپنی بساط پر
بچپن میں جو رٹا تھا، سند ہو گیا مجھے

یا

پھولوں سے بدن ڈوبتے دیکھے گئے اکثر
اس بحر میں تیرا نہیں پتھر کے سوا کچھ

زمانہ بدلتا ہے۔ اس کی تبدیلی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ معاشرے اور تہذیب کو متاثر کرتی ہے۔ پرانی قدریں معدوم ہو جاتی ہیں یا بے وقعت اور غیر اہم ہو جاتی ہیں۔ ان کی جگہ اخلاق و تہذیب کے نئے معیار قائم ہو جاتے ہیں اور آدمی نئے تقاضوں سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ یہ جدید عہد کی سچائی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اسے قبول کرنا پڑتا ہے۔ نشتر صاحب کے یہاں یہ سچائی ہمیں جا بجا نظر آتی ہے:

زندگی بھر کون کس کا ساتھ دیتا ہے یہاں
ایک لمحے کی وفا بھی تو وفا ہے جانِ من

یا

ہر سالِ نو پہ تجھ کو لکھوں نیک خواہشیں
آشوبِ روزگار میں اتنا بہت ہے یار

نشتر صاحب کو اردو پر جتنی دسترس ہے، اتنی ہی قدرت ہندی پر بھی۔ ہندی میں ان کی مختلف اصناف پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مضامین اور اخبارات کے لیے لکھے گئے مستقل کالموں کا تو خود ان کے پاس بھی ریکارڈ نہیں ہے۔ 1980 سے پہلے بجنور سے شائع ہونے والے ہندی ہفت روزہ ''چنگاری'' (جو بعد کو روزنامچہ ہوگیا) میں شائع ہونے والا ان کا مستقل کالم [illegible] اپنے لب و لہجے، تکنیک اور ٹریٹمینٹ کے اعتبار سے بہت ہی منفرد کالم تھا۔ ویسی تحریریں آج تک کہیں میری نظر سے نہیں گذریں۔ میں نے نشتر صاحب سے انھیں کتابی شکل میں جمع کر کے شائع کرنے کی کئی بار گذارش بھی کی۔ نشتر صاحب کی تالیف ''हिन्दी ग़ज़ल और उसका [illegible]'' ہندی غزل کے شائقین کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے، جسے بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔

نشتر صاحب کا دکھوں سے بہت قریبی رشتہ رہا ہے۔ ان دکھوں سے جو انھیں وقت اور حالات نے دیے۔ عزیزوں اور دوستوں نے دیے اور ان دکھوں سے بھی جو انھوں نے خود اپنے لیے پیدا کیے۔ وہ دکھوں کی شدت کو اپنی ذات پر ناپتے اور تولتے ہیں۔ درد کی ٹیسوں کو محسوس کرتے ہیں۔ اس کی کیفیات کو رنگوں میں ڈھالتے ہیں اور رنگوں کو لفظوں میں۔ اس طرح وہ بے جسم چیزوں کو جسم عطا کرتے ہیں۔ وہ اپنے زخموں کو خود ہی کریدتے ہیں اور خود کو لہولہان کرتے رہتے ہیں اور اس لہو سے اپنی شاعری کو سینچتے ہیں:

جنوں نہ کہیے اسے خود اذیتی کہیے
بدن تمام ہوا ہے لہو لہان مرا

شاید انھیں اس عمل میں لطف آتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی شاعری کی فضا بوجھل اور کہر آلود ہوتی، جس میں دم گھٹتا ہو۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ وہ ہمیں اپنے دکھوں سے دکھی نہیں کرتے بلکہ ہمارے دکھوں میں خود شریک ہوتے ہیں، ہمارے غم کو اپنا غم بنا لیتے ہیں۔

دھمک کہیں ہو لرزتی ہیں کھڑکیاں میری
گھٹا کہیں ہو برستا ہے سائباں میرا

اپنے ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں۔

''میں نے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں سے واقعی بہت دھوکے کھائے ہیں، لیکن مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ کیوں کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا، مجھے کرنا ہی چاہیے تھا اور جو عمل ان سے سرزد ہوا، وہ ان کے ظرف اور کردار کا نتیجہ ہے، اس میں وہ بھی مجبور رہے ہوں گے۔ جہاں تک تمہارا سوال ہے، میں ان کی صف میں تمہیں شامل نہیں دیکھتا اور نہ اس طرح کا کوئی شبہ تم پر کرتا ہوں۔ میری دلی تمنا ہے، تم ترقی کرو ہر میدان میں، چاہے وہ ادبی ہو یا کاروباری۔ مطمئن اور پرمسرت زندگی گذارو، جہاں تک میرا سوال ہے، میری ناؤ تیزی سے کنارے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ قوائے جسمانی کے ساتھ ساتھ ذہنی و دماغی صلاحیتیں بھی ضعف اور اضمحلال کی طرف مائل ہیں۔ زندگی میں کچھ نہیں کیا اور جو کیا اس کا حاصل نہیں۔ اب کفِ افسوس ملتا ہوں اور پچھتاتا ہوں کہ ادب و شعر کی جگہ اگر جوتا گانٹھنے کے فن میں مہارت حاصل کرتا تو شاید آج ان مسائل کا شکار نہ ہوتا، جن سے مجھے اب پایانِ عمر میں جو جھنا پڑ رہا ہے۔ خیر، حماقتوں کا خمیازہ تو بھگتنا ہی تھا۔''

(یکم/اکتوبر1980)

خوف نشتر صاحب کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو ہے، جس کے تار ان کی ذاتی زندگی سے جڑے ہیں۔ مسلسل بیماری، جسمانی کمزوری اور معاشی عدم تحفظ کا احساس، خوف بن کر ان کے حواس پر سوار رہتا ہے اور پھر یہ خوف ہر اس شخص کا خوف بن جاتا ہے، جو کسی نہ کسی طرح کے عدم تحفظ کا شکار ہے۔ مگر یہ خوف ان کی شاعری میں مجرد شکل میں اظہار نہیں پاتا، بلکہ کیفیت بن کر آتا ہے اور اردو شاعری کو ایک نئے احساس سے بھر جاتا ہے۔

نشتر خانقاہی نے غزل کی لسانی ساخت میں توڑ پھوڑ نہ کرتے ہوئے، نئی تراکیب اور نت نئے موضوعات کے استعمال سے اس کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے روایتی فارم کو قائم رکھتے ہوئے اسے ارتقا کی طرف لے گئے ہیں۔ یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

☐ ایک طویل مضمون کے اقتباسات جو نشتر خانقاہی کی زندگی میں لکھا گیا۔

☐☐☐

(بشکریہ ''تکمیل'' بھیوڑی، نشتر خانقاہی نمبر، اپریل تا دسمبر 2003)

نشتر خانقاہی

غزلیں

قلب مجروح میں جذبات کا محشر خاموش
دوپہر اور نشیمن میں کبوتر خاموش

سنگ باری کی ہر اک زخم گواہی، گویا
راستہ راستہ بکھرے ہوئے پتھر خاموش

گھر کی دہلیز پہ نیندوں کے فرشتے ساکت
اَن گنت خواب ادھر آنکھ کے اندر خاموش

عمر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ کا رُکنا، معلوم
گھر کی انگنائی میں بیٹھی ہوئی دختر خاموش

مفسدوں کے لیے گلزار خدا کی بستی
آسمانوں پہ بہت دور پیمبر خاموش

تیز سنگیت سے مجروح کی چیخیں نادم
شور انبوہ سے بازار کا منظر خاموش

سب کی مٹھی میں ہیں الفاظ کے کھوٹے سکے
دیکھ یہ شہرِ منافق ہے سخنور خاموش

شجر آنگن کا جب سورج سے لرزاں ہونے لگتا تھا
کوئی سایہ مرے گھر کا نگہباں ہونے لگتا تھا

تسلی دینے لگتی تھیں مجھے جز بندیاں اس کی
میں جب اک اک ورق ہو کر پریشاں ہونے لگتا تھا

سحر جس کی مناجاتوں سے تھی، راتیں تہجد سے
میں اس کی پاک صحبت میں مسلماں ہونے لگتا تھا

دعا پڑھ کے مری ماں جب مرے سینے پہ دَم کرتی
عقیدوں کے اندھیرے میں چراغاں ہونے لگتا تھا

پرانے پیڑ پھر تازہ پھلوں سے لدنے لگتے تھے
گئے موسم سے دل جب بھی گریزاں ہونے لگتا تھا

بتاؤں کیا کہ کیسا بامروّت شخص تھا وہ بھی
مجھے الزام دے کر خود پشیماں ہونے لگتا تھا

سامان دل دہی کا نہ راحت گھروں میں ہے
دن رات کا سفر ہے سکونت گھروں میں ہے

دستک پہ دوستوں کی بھی کھلتے نہیں ہیں در
ہر وقت ایک عجیب سی دہشت گھروں میں ہے

کیا پھر کہیں پہ کوئی بڑا حادثہ ہوا
کیوں آج اتنی بھیڑ عبادت گھروں میں ہے

بیرونِ در گلاب کی خوشبو ہے خیمہ زن
در پردہ اک اداس عفونت گھروں میں ہے

بنیاد اختلاف کی کچھ بھی نہیں، مگر
موجود بے سبب سی رقابت گھروں میں ہے

اچھے دنوں کی آس میں دیوار و در ہیں چپ
سڑکوں پہ قہقہے ہیں حقیقت گھروں میں ہے

جنگل میں جا بسیں گے اگر عافیت ملے
اب تک یقین تھا کہ حفاظت گھروں میں ہے

بے دشائی کے اندھیرے سلسلے آنے کو ہیں
اب کے اس جنگل میں بیہڑ راستے آنے کو ہیں

بستیوں میں بھاؤ خیموں کے بہت اونچے ہوئے
کیا کہیں سے پھر مہاجر قافلے آنے کو ہیں

سب شعاعیں دن کی آخر تیرگی نے چاٹ لیں
رات کے پردے پہ اب منظر نئے آنے کو ہیں

جن کی پیمائش نہ جن پر وقت کی کوئی گرفت
ہے سفر زندہ تو وہ بھی فاصلے آنے کو ہیں

ورد باطل ہو چکا، آنسو تاثر کھو چکے
اب مرے ہونٹوں پہ وحشی قہقہے آنے کو ہیں

دشت زادو! آنکھ تو کھولو کہ جنگل کی طرف
راستے الجھے ہوئے کچھ شہر سے آنے کو ہیں

دو گھڑی کو سونے والے کل کے سپنے بھول جا
آگے آگے اور لمبے رت جگے آنے کو ہیں

□□□

فانی بدایونی | ہماری مطبوعات سے | ("کلیاتِ فانی" سے ماخوذ)

غزلیں

1

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

کعبہ کو دل کی زیارت کے لیے جاتا ہوں
آستانہ ہے حرم میرے صنم خانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

اب اسے دار پہ لے جا کے سلا دے ساقی
یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لیے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

وحدتِ حسن کے جلووں کی یہ کثرت اے عشق
دل کے ہر ذرے میں عالم ہے پری خانے کا

چشمِ ساقی اثرِ مے سے نہیں ہے گلرنگ
دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

لوحِ دل کو غمِ الفت کو قلم کہتے ہیں
کُن ہے اندازِ رقم حسن کے افسانے کا

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

کس کی آنکھیں دمِ آخر مجھے یاد آئی ہیں
دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانی
آپ کی جان سے دور آپ کے مر جانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور فانی بدایونی کو ان کی زندگی ہی میں غزل کے چار ستونوں کی حیثیت دے دی گئی تھی لیکن ان میں سے ہر شاعر کا انداز سخن جداگانہ ہے فانی کی خصوصیت ان کی حزن پسندی ہے جس نے ان کے کلام میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ فانی کی کہی ہوئی نظمیں، قصیدے، قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شروع میں مرتب نے فانی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ 318 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 63 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40 فیصد خصوصی رعایت بھی دیتی ہے۔

2

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا
دولتِ دوجہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا
دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا
جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا
قبر میں جب کسی طرح دل کی تڑپ نہ کم ہوئی
یادِ خرامِ ناز نے حشر کا آسرا دیا
روزِ جزا گلہ تو کیا شکرِ ستم ہی بن پڑا
ہائے کہ دل کے درد نے درد کو دل بنا دیا
اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں
آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا
دل میں سما کے پھر گئی آس بندھا کے پھر گئی
آج نگاہِ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا
اُف کے گناہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف
آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا
آپ ہم اپنی آگ میں اے غمِ عشق جل بجھے
آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا جلا دیا
یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا
گریۂ آتشیں کی داد دے شبِ غم تو کون دے
خود سرِ شام کیا بجھی شمع نے دل بجھا دیا
یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیِ ناامید کو موت کا آسرا دیا

3

کمالِ ہوش ہے یوں بے نیاز ہوش ہو جانا
ترے آغوش میں بیگانۂ آغوش ہو جانا
ہمیں تیری محبت میں فقط دو کام آتے ہیں
جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی خاموش ہو جانا
وہی برقِ تجلی کارفرما اب بھی ہے لیکن
نگاہوں کو میسر ہی نہیں بے ہوش ہو جانا
شبِ وعدہ خدا ناکردہ وہ آئیں نہ موت آئے
تو پھر اے زندگی تو موت کا آغوش ہو جانا
خدا رکھے شرارِ عشق کو وہ شمعِ سوزاں ہوں
جلے جانا جسے ممکن ہے یا خاموش ہو جانا
بہار اپنی چمن اپنا قفس کی تیلیوں تک ہے
مبارک نکہتِ گل کو چمن بردوش ہو جانا
قیامت ہے یہ ٹکڑا داستانِ عشق کا یعنی
مرے راحت طلب دل کا اذیت کوش ہو جانا
مرقع ہے کسی کی ہستیِ موہوم کا فانی
وہ ان کا دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو جانا

4

بے خودی پہ تھا فانی کچھ نہ اختیار اپنا
عمر بھر کیا ناحق ہم نے انتظار اپنا
تابِ ضبطِ غم نے بھی دے دیا جواب آخر
ان کے دل سے اٹھتا ہے آج اعتبار اپنا
عشق زندگی ٹھہرا لیکن اب یہ مشکل ہے
زندگی سے ہوتا ہے عہد استوار اپنا
شکوہ برملا کرتے خیر یہ تو کیا کرتے
ہاں مگر جو بن پڑتا شکوہ ایک بار اپنا
غم ہی جی کا دشمن تھا غم سے دور رہتے تھے
غم ہی رہ گیا آخر ایک غمگسار اپنا
لے گیا چمن کو بھی موسمِ بہار آ کر
اب قفس کا گوشہ ہے حاصلِ بہار اپنا
جھوٹ ہی سہی وعدہ کیوں یقیں نہ کر لیتے
بات دلفریب ان کی دل امیدوار اپنا
انقلابِ عالم میں ورنہ دیر ہی کیا تھی
ان کے آستاں تک تھا خیر سے غبار اپنا
دل ہے مضطرب فانی آنکھ محوِ حیرت ہے
دل نے دے دیا شاید آنکھ کو قرار اپنا

5

نہ چاہا حسن کی فطرت نے کوئی داغ دامن پر
رہا محشر میں اپنا خون ناحق اپنی گردن پر
قیامت کی کشش رکھتے ہیں دانے میرے خرمن کے
کہیں کی بجلیاں ہوں آکے چھا جاتی ہیں خرمن پر
محبت میں ہمیں جی کھول کر رونا نہیں آتا
جو چار آنسو ہیں آنکھوں میں تو دو آنسو ہیں دامن پر
بتایا تھا نشیمن شاخ گل پر کس گھڑی یا رب
پچھی جاتی ہے ہر برق بلا شاخ نشیمن پر
مجھے کھینچے لیے جاتا ہے کیا جانے کہاں کوئی
نہ کچھ احسان رہبر ہے نہ کچھ الزام رہزن پر
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں دوستوں کو اور نہیں پاتیں
نظر اٹھتی ہے اب جس دوست پر پڑتی ہے دشمن پر
ہنسی آتی ہے تیری سادگی شوق پر فانی
وہ میت ہی پہ کب آئے جواب آئیں گے مدفن پر

6

کسی کی یادِ مژگاں دل میں جب نشتر چبھوتی ہے
خلش ہوتی ہے لیکن کس قدر پر لطف ہوتی ہے
قدم آہستہ اے امید رکھنا خانۂ دل میں
کہ میری آرزو آغوشِ محرومی میں سوتی ہے
تصنع سے نہیں خالی ضیائے حسنِ قدرت بھی
کہ شبنم رات بھر گلشن میں منھ پھولوں کا دھوتی ہے
مبارک جذبۂ دل اشکِ پیہم کا گہر ہونا
کسی کی یاد انھیں تار تصور میں پروتی ہے
کلیجہ تھام لو تم تابِ شیون لا نہیں سکتے
کہ میری موت میری بے کسی سے مل کے روتی ہے
جو پہلے نم کیا کرتی تھی ظالم تیرے دامن کو
وہ چشمِ خوں فشاں اب رخت ہستی کو بھگوتی ہے
نہ چھوڑا نخلِ غم کی آبیاری نے لہو باقی
سرشتِ عشق دل میں کس بلا کا بیج بوتی ہے
مری حسرت کو فانی کاش اتنا کوئی سمجھا دے
کہاں تک سوگواری، صبر کر، کیوں جان کھوتی ہے

7

خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں
زخمِ دل پیدا کریں یا زخمِ دل اچھا کریں
دل رہے آلودہ دامن اور ہم دیکھا کریں
آج اے اشکِ ندامت آ تجھے دریا کریں
جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں
خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسم گل آ گیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں
جابجا تغیر حال دل کے چرچے ہیں تو ہوں
ہم ہوئے رسوا مگر اب ہم کسے رسوا کریں
ہاں نہیں شرطِ مروّت حسرتِ تاثیر درد
رحم آ ہی جائے گا ان سے تقاضا کیا کریں
شوق نظارہ سلامت ہے تو دیکھا جائے گا
ان کو پردہ ہی اگر منظور ہے پردا کریں
ظرف ویرانہ بقدر ہمت وحشت نہیں
لاؤ ہر ذرّہ میں پیدا وسعتِ صحرا کریں
مرگِ بے ہنگام فانی وجہِ تسکیں ہو چکی
زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں

◻◻◻

حنا نقوی

ہاسپٹل مینجمنٹ میں کیریئر

اسپتالوں کا پیشہ ورانہ انداز میں انتظام و انصرام دراصل ایک نو خیز شعبہ ہے۔ اسپتالوں کا بندوبست بنیادی طور پر ایک جانا پہچانا اور پرانا شعبہ ہے۔ اسپتال کے بندوبست سے مراد دراصل اس کی مختلف سرگرمیوں کو ایک مربوط اور منظم شکل میں انجام دینا ہے۔ یہ بھی بالکل ہوٹلوں کے بندوبست کے مانند ہے۔ افسران سے متعلق مختلف شعبوں کے ناموں اور متعلقہ سرگرمیوں کی نوعیت میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

اسپتالوں، نرسنگ ہوم اور صحت کی دیکھ بھال کے مراکز کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن اسپتالوں کو قائم کرنا ہی کافی نہیں۔ انھیں کو عمدگی سے چلانے کے لیے ان کی مختلف سرگرمیوں اور شعبوں میں مکمل نظم و ضبط کی اشد ضرورت ہے تاکہ مریضوں کو بہتر سے بہتر طبی سہولیات بہم پہنچائی جا سکیں۔

اسپتالوں کے عملی بندوبست کے لیے ایک تربیت یافتہ منتظم کی ضرورت ہوتی ہے جو اسپتال کے کام کو پیشہ ورانہ انداز میں چلا سکے۔

دیگر تنظیموں کے لحاظ سے اسپتال کی سرگرمیاں حسب ذیل امور سے تعلق رکھتی ہیں۔

- منصوبہ بندی
- تشکیل
- تنظیم
- تال میل
- مانیٹرنگ اور تجزیہ کاری

اسپتال کے بندوبست اور انتظامیہ میں فرق:

عام آدمی کو ان دونوں میں ظاہری طور پر کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن حقیقتاً چند پہلوؤں کے لحاظ سے ان کے مابین قابل لحاظ فرق ہے۔ مینجمنٹ کے طور طریقے، وسائل کے بندوبست، اقتصادیات صحت (Health Economics) اعدادی تحقیق کے طریقے، صحت اور ترقی، انتظامی طرز عمل، ادارہ جاتی بندوبست، برتاوی سائنس ایسے موضوعاتی پہلو ہیں جنھیں ہاسپٹل مینجمنٹ کورس میں شامل کیا جا سکتا ہے تاکہ اس اسپتال کو عمدگی سے چلانے کے لیے درکار نظری اور عملی تکنیکوں کے مکمل اور نتیجہ خیز مجموعہ کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ اس طرح ہاسپٹل ایڈمنسٹریشن بھی ہاسپٹل مینجمنٹ کا ہی ایک حصہ ہوتا ہے۔

ہاسپٹل مینجمنٹ کورسوں کے اہم پہلو:

- صحت سے متعلق حکمت عملی اور بندوبست
- اقتصادیات صحت
- معاون کلینکل خدمات کی تنظیم اور بندوبست
- صحت منصوبہ بندی
- صحت کے قومی پروگراموں کا بندوبست
- مالیاتی بندوبست
- صحت خدمات کا مارکیٹنگ مینجمنٹ
- اسپتالوں کا قانونی ڈھانچہ
- مزدور قوانین اور صحت سے متعلق خدمات کے لیے درکار مالی وسائل
- تنظیمی طرز عمل
- اسپتال کی منصوبہ بندی

اہم آجرین:

- اسپتال
- نرسنگ ہوم
- تعلیمی ادارے جہاں اس طرح کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہو

کورسوں کی اقسام:

ہاسپٹل ایڈمنسٹریشن کا تعلق دو طرح کے گریجویٹوں سے ہوتا ہے: میڈیکل اور نان میڈیکل

- 3 سالہ ہاسپٹل مینجمنٹ کورس جو میڈیکل گریجویشن کے لیے ہوتا ہے۔

ایم ایس/بی.ڈی.ایس. یا اس کے مساوی اہلیت یا کم سے کم 50% نمبروں کے ساتھ بیچلر آف نرسنگ ڈگری اور پانچ سالہ تجربہ یا امیدوار کم سے کم 50% نمبروں کے ساتھ آرٹس/سائنس/کامرس میں گریجویٹ ہوں اور ہیلتھ کیئر/اسپتال میں کام کرنے کا پانچ سالہ تجربہ رکھتے ہوں۔

ہاسپٹل مینجمنٹ کورس کرانے والے ادارے:

میڈیکل طلبہ کے لیے:

- اے آئی آئی ایم ایس۔ انصاری نگر، نئی دہلی۔ 110029 (نان میڈیکل/اسپونسر کیے گئے امیدوار بھی جنھوں نے کوالیفائنگ امتحان میں کم سے کم 60% نمبر حاصل کیے ہوں اور کسی اسپتال میں منتظم کی حیثیت سے 7 سال خدمات انجام دی ہوں۔ اس کورس میں داخلے کے اہل ہوسکتے ہیں)۔
- آرمڈ فورسیز میڈیکل کالج، شولا پور روڈ، پونے۔ 411040
- کستور با میڈیکل کالج، نینی تال۔ 576119
- نظام انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسیز، پنجا گٹا، حیدرآباد۔ 500082
- نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ فیملی ویلفیئر، نیو مہرولی روڈ، منیرکا، نئی دہلی۔ 110067

یہاں سے پی جی سرٹیفکیٹ کورس (ہیلتھ اینڈ فیملی ویلفیئر مینجمنٹ) فاصلاتی تعلیم کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔

- یونیورسٹی آف دہلی، فیکلٹی آف مینجمنٹ اسٹڈیز، نئی دہلی۔ 110007 www.fms.edu

نان میڈیکل طلبہ کے لیے دستیاب کورس:

- ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس، سیون، ٹرامبے روڈ، دیونار، ممبئی۔ 400088
- اپولو انسٹی ٹیوٹ آف ہاسپٹل ایڈمنسٹریشن، اپولو ہاسپٹل کیمپس، جوبلی ہلز، حیدرآباد۔ 500033
- انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ مینجمنٹ ریسرچ (آئی آئی ایچ ایم آر) پربھودیال مارگ، سنگانیر ایئرپورٹ، جے پور۔ 302011
- شری راجندر میڈیکل کالج اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (یونیورسٹی کے درجے کا ادارہ) پورر، چنئی۔ 600116

ان اداروں میں داخلہ بالعموم مقابلہ جاتی داخلہ امتحان کے ذریعے ہوتا ہے۔

□□□

(بشکریہ ''روزگار سماچار'' 8 تا 21 فروری 2006)

ہمیں اپریل کوئز انعامی مقابلے کے متعدد جوابات موصول ہوئے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. **علی یاور**
معرفت ''جہان اردو''
رحم گنج، دربھنگا۔ 846004 (بہار)

2. **ارشاد عالم**
پیتو بیٹری ورکس
قطب گڑھ
دلی۔ 039 110

3. **ابصار طلعت**
معرفت ''جہان اردو''
رحم گنج، دربھنگا۔ 846004 (بہار)

انعام یافتگان کو ادارے کی جانب سے مبارک باد۔
آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کردیے جائیں گے۔

(ادارہ)

اپریل انعامی مقابلہ (کوئز) کے صحیح جوابات:

1. ب	2. الف	3. الف	4. ج	5. د
6. الف	7. الف	8. د	9. الف	10. ب
11. ب	12. د	13. ب	14. ج	15. د
16. ب	17. الف	18. ب	19. ج	20. د
21. د	22. د	23. ب	24. الف	25. د
26. د	27. الف	28. د	29. د	30. ب
31. د	32. د	33. ج	34. الف	35. ب
36. الف	37. الف	38. ب	39. ب	40. د
41. ج	42. الف	43. الف	44. الف	45. د
46. د	47. د	48. الف	49. د	50. ج

فیروز ہاشمی

خط و کتابت یا ای میل

طریقۂ استعمال اور فائدے

خط و کتابت ذاتی ہو یا تجارتی اس کا استعمال اگر اچھے طریقے سے کیا جائے تو اس کے بڑے ہی دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔ آپ کی ذرا سی کاہلی یا خوش فہمی آپ کے مقصد میں تاخیر یا ناکامی کا سبب بن سکتی ہے۔ ای میل یا خط و کتابت کی خوبیوں اور خامیوں پر مشتمل یہ مضمون قارئین ''اردو دنیا'' کی نذر ہے۔

یوں تو خط و کتابت کا رواج صدیوں سے ہے جسے لکھنے بھیجنے اور وصول کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے رہے ہیں لیکن موجودہ دور میں اطلاعاتی تکنیک میں آئے انقلاب نے بہت کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ اسی انقلاب کی ایک دین ہے ای میل یعنی الیکٹرونک میل — خط و کتابت کا الیکٹرانک طریقہ۔ اس طریقے سے بہت مختصر مدت میں آپ اپنا پیغام مطلوبہ شخص تک پہنچا سکتے ہیں لیکن ایک معمولی غلطی سے آپ کی درخواست کئی دنوں اور مہینوں تک معلق رہ سکتی ہے۔

مراسلہ نگاری یا خط و کتابت، درخواست وغیرہ معمولی تبدیلی کے ساتھ عام زندگی کی ضرورت ہے۔ اس کے چار اہم حصے ہوتے ہیں۔ (1) مخاطب: یعنی جسے آپ خط لکھنا چاہتے ہیں اس کا پورا نام اور پتہ۔ (2) سلام وتحیات: اپنے مخاطب کو بڑے چھوٹے یا ہمجولی کے لیے مناسب القاب و آداب کا استعمال جیسے بڑوں کے لیے مکرمی ومحترمی، مکرم ومحترم، جناب اور محترم وغیرہ۔ چھوٹے کے لیے عزیزم، عزیزی، عزیزہ وغیرہ۔ ہمجولی کے لیے مشفق، مہربان، یا اپنی قربت کے اعتبار سے کسی اور مناسب لفظ کا استعمال کرسکتے ہیں۔ (3) مدعا: سلام وخیریت کے بعد اصل مقصد یا مدعا واضح طور پر بیان کریں۔ بہتر ہوگا کہ اپنا مقصد مختصر اور جامع طریقے سے بیان کریں۔ (4) خاتمہ: اس میں آپ اپنے مخاطب کے تئیں نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے اپنا نام، عہدہ، اور پتہ ضرور لکھیں۔

کاروباری خط میں چند باتوں کا اضافہ کیا جانا بہتر ہے۔ مثال کے طور پر مخاطب کا پورا نام اور پتہ تحریر کرنے کے بعد آپ اپنی غرض و غایت جسے انگریزی میں سبجیکٹ کہتے ہیں ضرور لکھیں اور اس سطر کو واضح لکھیں تاکہ مخاطب کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے۔ اس سے فوری کارروائی میں مدد ملتی ہے۔ پتے کے ساتھ پن کوڈ (Postal Index Number) کا استعمال ضرور کریں۔ اس سے آپ کا خط پہنچنے میں اور مخاطب کو آپ کے بارے میں جاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس سے صوبہ، ضلع اور اس کے بعد شہر یا ڈاک خانے کا پتہ چلتا ہے جس کی وجہ سے آپ کا خط براہ راست اسی ڈاک خانے میں جائے گا جہاں کا پن کوڈ لکھا ہے۔ اس طرح آپ کا مقصد آسانی سے اور جلدی حل ہوجائے گا۔ ہمارے ملک میں ایک ہی نام کے کئی گاؤں، شہر، سڑک اور محلے موجود ہیں۔ پن کوڈ اس شبہ کو ختم کرتا ہے اور مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ تجارتی خطوط عموماً لیٹر ہیڈ پر لکھے جاتے ہیں اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ ایسے خطوط کاروباری ادارے یا تعلیمی ادارے کے لیٹر ہیڈ پر لکھے جائیں تاکہ کسی قسم کے یا دھوکے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس سے مخاطب کو بھی جواب دینے میں آسانی ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں فون/فیکس نمبر، ای میل پتہ واضح طور پر لکھنا چاہیے۔ عموماً لیٹر ہیڈ چھپے ہوئے ہوتے ہیں جس میں کمپنی یا ادارے کا نام، پورا پتہ مع پن کوڈ، فون/فیکس نمبر مع ایس.ٹی.ڈی.، آئی.ایس.ڈی.کوڈ، ای میل اور ویب سائٹ پتے موجود ہوتے ہیں۔ ان ساری اطلاعات سے آپ کے ادارے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جن اداروں کے پاس ای میل پتہ اور ویب سائٹ کی سہولت مہیا نہیں ہیں وہ فرضی نام و پتہ شائع نہ کریں۔ بعض اداروں کے لیٹر ہیڈ پر ویب پتے لکھے ہوتے ہیں جبکہ ان کا ویب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس طرح کی غلطیوں سے ادارے کا فائدہ ہونے کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اپنا پتہ اور مخاطب کا پتہ خط اور لفافہ دونوں میں لکھیں۔ کیونکہ زیادہ تر کاروباری خطوط مخاطب کے علاوہ اس کا معاون کھولتا ہے اور دونوں یہ غلطی کرسکتے ہیں کہ خط تو نکال کر اپنی میز پر مقررہ فائل میں رکھ لیں اور لفافے کو ردی کی ٹوکری کی نذر کردیں۔ مخاطب باری باری کئی خطوط کا جواب دیتا ہے۔ جب خط میں پتہ نہیں ہوگا تو جواب لکھے جانے کے باوجود اسے آپ کو بھیجا نہ جاسکے گا یا پتہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا جواب ہی نہ دیا جائے، ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

ای میل بھی دونوں طرز کے ہوسکتے ہیں ذاتی اور کاروباری۔ ان میں بھی خط و کتابت جیسے امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ذاتی ای میل میں بھی اپنا پورا نام، پتہ وغیرہ تحریر کریں۔ آخر میں یا شروع میں جیسا آپ بہتر سمجھیں ای میل پتہ صحیح لکھیں۔ مخاطب یا From میں اپنا واضح نام جس سے آپ

جانے جاتے ہیں یا ای میل پتہ ہونا چاہیے۔ سبجیکٹ کے کالم میں واضح الفاظ لکھیں تاکہ پانے والے کو سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ فوراً آپ کا جواب دے سکے یا کم از کم کارآمد سمجھ کر محفوظ رکھ سکے۔ چونکہ اس وقت ژنک ای میل کی بھرمار ہے۔ جو لوگ ای میل سے استفادہ کر رہے ہیں انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے۔ اگر آپ غیر واضح یا غیر مانوس سبجیکٹ لکھیں گے یا From میں غیر مانوس الفاظ ہوں گے تو فضول ای میل کے ساتھ اسے بھی ضائع ہونے کا پورا خدشہ رہتا ہے۔

کاروباری ای میل میں اس بات کا خیال رکھیں کہ جس فورمیٹ میں آپ اسے تیار کر رہے ہیں، پانے والے کے پاس وہ سافٹ ویئر ایپلی کیشن ہونا چاہیے۔ بصورتِ دیگر آپ اس خط کو GIF فورمیٹ میں تبدیل کر کے روانہ کریں۔ آپ اسے PDF میں بھی روانہ کرسکتے ہیں۔ پی.ڈی.ایف. کی خصوصیت یہ ہے کہ وصول کنندہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔ جتنا خوبصورت آپ نے خط لکھا ہے اتنا ہی بہتر اسے وہ اپنے یہاں پرنٹ کرسکتا ہے۔ GIF میں یہ خوبصورتی ختم ہوجاتی ہے لیکن مدعا حاصل ہوجاتا ہے۔ ان پیج اردو کے تازہ ترین ورژن میں راست اردو میں ای میل کی سہولت فراہم کردی گئی ہے۔ ای میل کا کمانڈ دینے پر خود بخود GIF جنریٹ کر کے Outlook Express چلا دے گا۔ اب آپ مخاطب کا پتہ ٹائپ کریں۔ سبجیکٹ لکھیں اور send کردیں۔ (یاد رکھیں ان پیج میں اردو ای میل کی سہولت Outlook کے ساتھ نہیں ہے۔) کاروباری ای میل میں بھی صرف اپنے نام یا صرف اپنے عہدے سے کام نہ چلائیں۔ بلکہ پورا نام اور پتہ مع عہدہ لکھیں تاکہ آپ کے ای میل پر فوری کارروائی کی جائے۔

□□□

Q A Enginner, Inpage Urdu,
423 Galleria, DLF Phase IV,
Gurgaon-122002

دیوان آبرو

مرتب: ڈاکٹر محمد حسن

شاہ مبارک آبرو کا کلام شمالی ہند کی اردو شاعری کی اوّلین یادگاروں میں سے ہے اور اپنے دور کی عکاسی کے اعتبار سے صحیح معنوں میں گویا مرقع دہلی ہے اور جمالیاتی کیف سے بھی خالی نہیں ہے۔ یہ دیوان ڈاکٹر محمد حسن نے کلیاتِ آبرو کے چھ دستیاب مخطوطوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور اس پر مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ جو طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 377، قیمت: -/25 روپے

دستنبو

مصنف: مرزا غالب، مترجم: خواجہ احمد فاروقی

یہ مرزا غالب کی مشہور فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جو خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے۔ کتاب ان واقعات کے دیدہ وشنیدہ احوال کے بیان پر مبنی ہے جو 1857 کی فوجی بغاوت کے دنوں میں دارالسلطنت دہلی میں رونما ہوئے۔

صفحات: 88، قیمت: -/12 روپے

افغانستان میں جدید دری (فارسی) شاعری

مصنف: ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد

یہ کتاب ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد کے فارسی تحقیقی مقالے پر مبنی ہے جسے ڈاکٹر شعیب اعظمی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اس کے مطالعے سے افغانستان کی جدید فارسی شاعری اور موجودہ دور کے اہم شاعروں سے واقفیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے طلبہ اور فارسی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک اہم تحفے سے کم نہیں۔

صفحات: 317، قیمت: -/80 روپے

پرواز

مصنف: ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام

ترجمہ اور تلخیص: گلزار (نقل حرفی۔ فرحانہ محمود)

صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی خودنوشت سوانح عمری "پرواز" نہ صرف ڈاکٹر کلام کی نجی زندگی کی روداد ہے بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آزاد ہندوستان کی تدریجی پیش رفت کی کہانی بھی بیان کرتی ہے۔ ان ولولہ انگیز واقعات وحقائق پر مشہور مصنف اور فلم ڈائرکٹر جناب گلزار نے یہ دلچسپ سی.ڈی. (آڈیو ورژن) تیار کی ہے۔

قیمت (کتاب مع سی.ڈی.): -/175 روپے

نوٹ: طلبه اور اساتذه کے لیے40%کی خصوصی رعایت. تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا.

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

پنیت گیر، استوتی ترپھان، سمراٹ شرما

"C ایڈونچر" سے ماخوذ

ایریز اور اسٹرنگس

ایریز (arrays) کے ذریعہ ایک ہی طرح کا ڈیٹا اسٹور (data store) کیا جاتا ہے۔ آپ ایرے کی تصویر (picture) کمپیوٹر میموری (memory) میں لگاتار جگہ (spaces) پر درج کر سکتے ہیں۔ ہر ایک ڈیٹا جو اسٹور کیا جاتا ہے وہ ایلیمنٹ (element) کہلاتا ہے۔

8.1 ایریز کی وضاحت

ایرے کی وضاحت کے لیے ہمیں ڈیٹا کی قسم، اس کے نام، اس کے سائز کی ضرورت پڑتی ہے لیکن اس سے قبل یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ایرے کا ایک قابل قبول نام ہو۔ مثال کے طور پر: int arrayOfInts[5];

مندرجہ بالا ایرے کی پانچ انٹیجر ویلیوز (integer values) کمپیوٹر میموری (memory) میں محفوظ ہیں۔ ایلیمنٹ کی گنتی کو بریکیٹ میں درج کرنا چاہیے۔ شروع میں اگر آپ ایلیمنٹس کے نمبر مخصوص نہیں کرتے ہیں تو کمپیوٹر خود بتا دے گا کہ اس میں کتنے ایلیمنٹس ہیں۔

8.2 ایریز کا شروع کرنا

ایلیمنٹس کی ویلیوز (values) کو آپ کئی طرح سے دکھا سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ہم 1 سے 10 تک کے نمبروں کو ایرے کی شکل میں درج کرنا چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل طریقوں سے درج کیے جا سکتے ہیں:

```
int arrayOfInts[10] = {1,2,3,4,5,6,7,8,9,10};
```

یا

```
arrayOfInts[0]=1;
arrayOfInts[1]=2;
arrayOfInts[2]=3;  /Assume that the array has been declared! */
arrayOfInts[3]=4;
arrayOfInts[4]=5;
arrayOfInts[5]=6;
arrayOfInts[6]=7;
arrayOfInts[7]=8;
arrayOfInts[8]=9;
arrayOfInts[9]=10;
```

یا

```
int arrayOfInts[]={1,2,3,4,5,6,7,8,9,10};  /*an unsized array*/
```

یا

```
int arrayOfInts[] = {10};
```

```
int i;
for(i=0;i<10;i++)
arrayOfInts[i] = i +1;
```

آپ نے یہ غور کیا ہوگا کہ ایرے کے پہلے ایلیمنٹ میں ایک کے بجائے صفر (zero) ہے یہ ایک آسان، لیکن بہت ہی اہم طریقہ ہے جسے ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب آپ 10 یا مختلف ایریز کو نامزد کر لیں تو آگے کی کارروائی آسان ہو جاتی ہے!

کمپیوٹر کی میموری میں یہ ایرے مندرجہ ذیل شکل میں نظر آئے گی:

Array's element number:

0	1	2	3	4	5	6	7	8	9

Array Of Ints :

1	2	3	4	5	6	7	8	9	10

8.3 عام ایرے کی کارروائی

ایرے کے کنٹینٹس (contents) کو ایک سب سے آسان طریقہ سے پرنٹ (print) کرنے کے لیے مندرجہ ذیل شکل میں دکھائیں گے:

```
#include<stdio.h>
int main()
{
int anotherIntArray[5] = {1,2,3,4,5};
int i;
for(i=0 ; i<5 ; i++)
printf("anotherIntArray[%d]has a value of%d\",i,anotherIntArray[i]);
return 0;
}
```

ایرے کے کنٹینٹس (contents) کو یہ پروگرام "anotherIntArray" اس طرح دکھائے گا:

```
anotherIntArray[0]has a value of 1
anotherIntArray[1]has a value of 2
anotherIntArray[2]has a value of 3
anotherIntArray[3]has a value of 4
anotherIntArray[4]has a value of 5
```

ایرے ایلیمنٹس کا داخلہ (Enter) مندرجہ ذیل پروگرام سے پائی جا سکتی ہے:

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی۔ایس۔آئی۔آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب "C" ایڈونچر" سے اقتباس پیش ہے۔ اس کتاب کے ایڈیٹر وی۔کے۔گپتا، معاون ڈاکٹر راجیو گپتا اور اردو ایڈیٹر ڈاکٹر رویندر کمار ہیں۔

```
#include<stdio.h>
int main()
{
int anotherIntArray[5];
int i;
printf("Enter 5 integers one by one, pressing enter after each one:\n");
for(i=0 ; i<5 , i++)
scanf("%d", &anotherIntArray[i]);
for(i=0 ; i<5 ;i++)
printf("anotherIntArray[%d] has a value of %d\n",i,anotherIntArray[i]);
return 0;
}
```

اریے کے اس پروگرام کے بعد کچھ اس طرح کا پرنٹ آؤٹ ملے گا:

5انٹیجر س (integers) کے بعد دیگرے انٹر (enter) کی بٹن ہر بار دبا کر کمپیوٹر میں داخل کریں:

```
2
3
4
6
9
anotherIntArray[0] has a value of 2
anotherIntArray[1] has a value of 3
anotherIntArray[2] has a value of 4
anotherIntArray[3] has a value of 6
anotherIntArray[4] has a value of 9
```

8.4 کیریکٹر اریز (Character Arrays)

ابھی تک شاید سب سے زیادہ استعمال میں آنے والی اریز کے انٹیجر س (integers) کی مثالیں دی گئی ہیں۔ آپ اریز کا استعمال doubles, floatsاور chars کے استعمال میں کر سکتے ہیں۔ اریے کے ہر ایک ایلیمنٹ کا ایک مخصوص کیریکٹر ہوگا۔ لیکن اگر آپ اریے کا آخر ('\0'(that is, backslash and zero), NULL CHARACTER سے) دکھاتے ہیں تو آپ STRING CONSTANT کے نام سے جانے والے ایلیمنٹ نل کیریکٹر (NULL CHARACTER) اس کڑی کا آخر ہوگا۔ پرنٹ ایف فنکشن (printf functions) کے لیے مفید ہے۔ اب آپ کو ایسی مثالیں بتائی جا رہی ہیں جو کیریکٹر اریے اور اسٹرینگس دونوں پر مبنی ہیں۔

```
#include<stdio.h>
int main()
{
char charArray[6] = {'F','r','i','e','n','d'};
char charString[8] = {'F','r','i','e','n','d','s','\0'};
int i;
for(i=0 ;i<6 ; i++)
printf("charArray[%d] has a value of %c\n",i,charArray[i]);
/* Using Strings */
printf("My favourite comedy is%s\n",charString);
return 0;
}
```

آپ نے غور کیا ہوگا کہ ہر ایک کریکٹر کو ایک ہی کوٹ مارکس (quote marks) سے دکھایا گیا ہے۔ ڈبل کوٹ مارکس (double quote marks) اسٹرنگس کے لیے محفوظ ہے۔ کیریکٹر اور اسٹرینگ فارمیٹ کے لیے بھی مخصوص نشان استعمال کیے گئے ہیں۔ (جیسے c%اور s%۔)

اوپر دیئے کوڈ کے لیے آؤٹ پٹ مندرجہ ذیل طریقہ سے ہوگا:

```
charArray[0] has a value of F
charArray[1] has a value of r
charArray[2] has a value of i
charArray[3] has a value of e
charArray[4] has a value of n
charArray[5] has a value of d
My favourite comedy is Friends
```

8.5اسٹرینگس کا تعارف

اسٹرینگ کا کیریکٹر اریز کے کیریکٹر سے کافی ملتا جلتا ہے۔ اس میں کیریکٹرس کے اسٹور کے لیے سلسلہ وار میموری لوکیشنس (memory locations) ہیں وہ خاص اس لیے ہیں کہ اس میں نل کیریکٹر (\0) NULL CHARACTER ہیں جو ایک کیریکٹر کے گروپ کو خاص معنی عطا کرتا ہے۔ کیریکٹر کا ایک گروپ جو '\0' کے بعد آتا ہے۔ اسٹرینگ کہلاتا ہے۔ اور اس کا خاتمہ '\0' سے ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا کی مثال کے لیے اریے اور اسٹرینگ کیریکٹر کا اسٹور میموری میں مندرجۂ ذیل طرح سے دکھائی دے گا:

```
'F'   'R'   'I'   'E'   'N'   'D'   'S'
Character Array
F     R     I     E     N     D     S     \0
String
```

اسٹرینگ کانسٹنٹ

اگر آپ ایک اریے (Char) کو ڈیٹا کی طرح لکھتے ہیں اور نل کیریکٹر کے ساتھ جوڑتے ہیں تو آپ کو ایک اسٹرینگ کانسٹنٹ ملے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ ایک اریے کیریکٹر کو اسٹرینگ کانسٹنٹ سے شروع کرتے ہیں جو کہ ڈبل کوٹ (double quote) سے جڑا ہوا ہو لیکن نل کیریکٹر کے ساتھ نہ ہو تو آپریٹر اپنے آپ ہی جان لے گا کہ یہ اسٹرینگ ہے۔

اس طرح کی تین مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

```
#include<stdio.h>
int main()
{
int i, a="h"; /* character constants */
char b= 'i';
```

```
char array 1[4] = {'M','i','l','k'}; /* a character array */
char array2[7] = {'C','o','f','f','e','e','\0'}; /* a string constent */
/* don't forget to add an extra element for the null character! */
char array3[] = "Or you can specify an unsized char array";
printf("The numeric value of a is %d\n",a);
printf("The numeric value of b is %d\n\n",b);
printf("The character that a holds is %c\n", a);
printf("The character that b holds is %c\n", b);
/* printf("array1 holds %s\n", array1); is illegal - array1 NOT a string */
printf("\narray1 holds:\n\t");
for(i=0 ; i<4 ;i++)
printf("%c", array1[i]; /* but is a character array */
printf("\narray2  holds:\n\t%s\n",array2);
printf("array3  holds:\n\t%s\n", array3);
return 0;
}
```

اس کوڈ کا آؤٹ پٹ اس طرح ہوگا:

a کی عددی قیمت 72 ہے۔

b کی عددی قیمت 105 ہے۔

a کا کیریکٹر H ہے۔

b کا کیریکٹر i ہے۔

ایرے 1 کے معنی۔

Milk

ایرے 2 کے معنی:

coffee

ایرے 3 کے معنی:

یا آپ بغیر سائز کے کیر ایرے (char array) مخصوص کر سکتے ہیں۔

a اور b میں کیریکٹرس کی عددی قیمت پہلے پرنٹ ہوں گے اس کے بعد ان کے کیریکٹر کا طریقہ پرنٹ ہوگا۔

8.6 اسٹرنگس کا پڑھنا

ایک اسٹرنگ میں پڑھنے کے لیے ایک ممکن طریقہ تو scanf() کے استعمال سے ہے۔ لیکن اس طریقے میں پریشانی یہ ہے کہ اگر آپ ایسے اسٹرنگ کو انٹر (Enter) کر رہے ہیں جس میں ایک یا اس سے زیادہ جگہیں (spaces) ہیں۔ تو scanf() جگہ (space) تک پہنچ کر پڑھنا بند کر دے گا۔ یا اگر انٹر (enter) کو دبا دیتے ہیں تو اسٹرنگ کا ایک حصہ ختم ہو جائے گا۔

اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ **gets()** function کا استعمال کیا جائے اس میں ایرے کے کیریکٹر کا نام دینا ضروری ہے۔ لیکن ایرے کو پہلے واضح کرنا مت بھولیے۔ **gets()** function سبھی کیریکٹرس کو پڑھنے کے بعد '\0' کو بھی جوڑتا ہے۔ اور اسٹرنگ اپنے مخصوص خانہ میں اسٹور بھی ہو جاتا ہے۔

8.7 اسٹرنگس کا لکھنا

اسٹرنگ کو لکھنے کے لیے ایک ممکن طریقہ printf() اور مخصوص اسٹرنگ فارمیٹ (string format) بھی ہے۔

لیکن یہاں پر **puts()** function سے آپ کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔ یہ gets() جیسا ہی ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی آرگومنٹ اسٹرنگ (argument string) کے نام کو ہی لیتا ہے۔ اسٹرنگ کے پرنٹ کرنے کے بعد یہ فنکشن اپنے آپ ایک ہی لائن کے کیریکٹر کو جوڑ دیتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں کچھ خامیاں بھی آ جاتی ہیں اس لیے اس کی جگہ پر printf() کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن scanf اور frintf کے ساتھ اگر آپ gets اور puts کا استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو stdio.h ہیڈر فائل (header file) جوڑنی پڑے گی۔

اس مثال پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کر سکتے ہیں۔ لیکن دیکھیے اور کوشش کیجیے کہ کیا نتیجہ آتا ہے۔ اگر آپ scanf میں دو لفظوں کو انٹر (enter) کرتے ہیں تو eh? strings میں پڑھنے کے لیے scanf کے استعمال سے گریز کریں۔

```
#include<stdio.h>

int main()

{

char  array1[50];

char  array2[50];
printf("Try entering a string less than 50 characters with spaces:\n");
gets(array2);
printf("\nYou  entered:");
puts(array2);
printf("now enter another string less than 50 characters, with spaces: \n");
scanf("%s",array1);
printf("\nYou  entered:%s\n",array1);
return 0;
}
```

اب اس کے آؤٹ پٹ کو دیکھیں۔

ایک ایسی اسٹرنگ کو انٹر (enter) کرنے کی کوشش کریں جو اسپیسز (spaces) کے ساتھ 50 کیریکٹر سے کم ہوں:

Do You C

آپ Do You C انٹر (enter) کریں۔

آپ ایک دوسری اسٹرنگ انٹر (enter) کریں جو اسپیسز (spaces) کے ساتھ 50 کیریکٹرس سے کم ہوں:

Do You C

آپ Do You C انٹر (enter) کریں۔

حفاظت کے مدنظر scanf کے بجائے gets کا استعمال کریں۔ اگر یوزر (user) کو اسٹرنگ کے لیے scanf() کے ان پٹ (input) کی ہدایت دیتے ہیں تو اسپیس (space) کے بعد اسٹرنگ اسٹور (store) نہ کریں۔

□□□

رضوان رضوی

منزل قریب ہے

(باپ کا خط بیٹے کے نام)

میرے عزیز بیٹے!

مجھے یہ جان کر کافی تکلیف پہنچی کہ ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے تم اب اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے ہو، لیکن شاید تم نہیں جانتے کہ مایوسی ایک گناہ ہے۔ میں یہ مان لیتا ہوں کہ تین سال سے تم ملازمت کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہو۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دفتروں میں حکومت کی مشنری کے کل پُرزے رشوت کے بغیر کسی کی بات تک سننے کو تیار نہیں اور یہ بھی مان لیتا ہوں کہ تمھارے ساتھ امتیاز اور تعصب برتا جاتا ہے لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تمھاری جدو جہد میں کہیں نہ کہیں ضرور کچھ خامیاں ہیں جن کی بنا پر تم اب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور اسی لیے سرکاری ملازمت سے محرومی تمھیں بد دل بنا چکی ہے اور تم ملازمت سے اپنی توجہ ہٹا کر آگے بڑھنے کے لیے اپنے آپ میں یقین و اعتماد نہیں پاتے ہو۔ میں کہوں گا کہ تم اس میں یقین کی کرن کا سراغ لگاؤ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ زندگی کے افق پر چھایا ہوا اندھیرا دور ہو جائے تو پہلے اپنے دل میں یقین کی شمع روشن کرو۔ کیوں کہ جو لوگ پختہ یقین و اعتماد کے مالک ہوتے ہیں وہ اپنی نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ انھیں افق حیات روشن نظر آتا ہے اور وہ یقین کے ساتھ زندگی کے طلسم ہوشربا کو سر کرنے کے لیے اپنی کمر کس لیتے ہیں۔

بیٹے! میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمھاری عقل ماری گئی ہے۔ تمھارے طور طریقے اور سوچنے سمجھنے کے انداز بدل گئے ورنہ تم اپنے ہی وطن میں اپنے آپ کو بے سہارا خیال نہیں کرتے۔

تم نے ملک میں بے انتہا بے کاری اور بے روزگاری کی وجہ دریافت کی ہے تو سن لو۔ پہلی وجہ تو ملک کی آبادی میں بے انتہا اضافہ ہے۔ وطنِ عزیز کی آبادی میں اضافے کی شرح بہت زیادہ ہے لیکن ملازمتوں میں اس قدر اضافہ نہیں ہو رہا ہے اور جب تک آبادی میں اضافے کی شرح کم نہیں ہوتی بے روزگاری کے مسئلے کا حل ہونا کافی دشوار ہے۔ امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی یہ مسئلہ مکمل طور سے حل نہیں ہو سکا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارا ملک معاشی بحران میں مبتلا ہے۔ بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ زبردست الجھن بنا ہوا ہے۔ حکومت تمام لوگوں کو ملازمت نہیں دے سکتی۔

ملک میں بے کاری کی دوسری اہم وجہ یہاں کا ناقص طریقۂ تعلیم ہے۔ انسانی زندگی میں تعلیم کی زبردست اہمیت ہے۔ تعلیم روشنی ہے اور جہالت تاریکی۔ لیکن آج ہم میں سے کتنے ہیں جو اس حقیقت کو جاننے کے باوجود اس پر عمل پیرا ہیں۔ علم کے فیوض و برکات کا ہم میں سے اکثر کو احساس ہے۔ لیکن ہم لوگ روز مرّہ کے معمولات اور آلائشوں میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ ہمیں روشنی اور تاریکی کا احساس تک نہیں۔ بغیر تعلیم کے انسان صحیح معنی میں انسان نہیں بنتا۔ اس کی عدم موجودگی کا سماج اور ملک پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ ملک اور سماج میں اخلاقی اور معاشی برائیاں آ جاتی ہیں۔ موجودہ طریقۂ تعلیم زندگی کو یک طرفہ بنا رہی ہے۔

موجودہ طریقۂ تعلیم سے ملک میں بے روزگاری کا مسئلہ حل ہونے کے بجائے مزید الجھتا جا رہا ہے۔ کیوں کہ جتنے بھی لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں ان سبھوں کا مقصد ملازمت کا حصول ہوتا ہے۔ ظاہر ہے سبھوں کو بیک وقت حکومت نوکری نہیں دے سکتی اور اس طرح بے روزگاری کا مسئلہ بجائے حل ہونے کے الجھتا جاتا ہے۔ اس لیے ایسا طریقۂ تعلیم ہو کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد طالب علم صرف کتابی دنیا تک محدود نہ رہے بلکہ عملی دنیا سے بھی اس کا گہرا لگاؤ رہے۔ یہی طریقۂ تعلیم انسان کو عملی، صنعتی اور تجارتی حلقوں میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

میرے عزیز بیٹے! یہ زمانہ سخت مقابلے کا ہے۔ اگر تم ملازمت چاہتے ہو اور عزت و وقار کے ساتھ جینا چاہتے ہو تو میرا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ پہلے تو تم اپنی بنیاد کو مضبوط کرو اور اس کے بعد سول سروس، میڈیکل یا انجینئرنگ کے

مسابقتی امتحان کی تیاری میں لگ جاؤ۔ اس کے لیے مختلف رسائل اور ان سے تعلق رکھنے والی کتابوں کا خوب مطالعہ کرو۔ ایک بار میں نہیں دوسری بار میں، دوسری بار میں نہیں تو تیسری بار میں کامیابی یقیناً قدم چُومے گی۔ اس کے لیے ہمت اور حوصلہ چاہیے۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتے تو پھر ملازمت کا خیال ذہن سے نکال دو اور حالات حاضرہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی منزل کے لیے کوئی نیا راستہ تلاش کرو۔ وقت کی قدر کرو۔ اس کو فضول اور غیر ضروری مباحث میں ضائع نہ کرو۔ اپنی، اپنے خاندان اور ملک کی ترقی کے لیے تمھارا کردار عام انسانوں سے مختلف ہونا چاہیے۔ یہ دنیا کوئی چھٹی کا دن نہیں بلکہ اسکول کا کمرہ ہے جہاں تمھیں ہر روز پہلے سے بہتر ہونے کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ایک مصروف آدمی کے پاس سب کچھ کرنے کو وقت ہوتا ہے جب کہ ایک بے کار، کاہل اور باتونی آدمی کو کچھ بھی کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ نئی منزل کو پانے کے لیے نئے راستے کی تلاش کل سے شروع کریں گے تو سن لو کہ کل کسی بھی کام کے لیے بہت دیر کا وقت ہے۔ اور جو کل کے چکر میں اپنی مدد اور نجات ڈھونڈتا ہے وہ ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ موقع نہ ملنے کی شکایت کمزور، بزدل اور نکمے آدمی کیا کرتے ہیں۔ سب سے اچھا اور عقلمند وہ نہیں جو اپنے حسب حال موقعے کی تلاش میں رہ کر وقت ضائع کرتا ہے بلکہ وہ ہے جو ہر موقعے کو اپنا غلام بنا کر اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

میرے پیارے بیٹے! یہ حقیقت ہے کہ آج زندگی، ماحول اور سماج کی بدتر حالت، معاشرے کا بکھرا ہوا شیرازہ ملک کا ہر شہری محسوس کر رہا ہے۔ لیکن صرف لوگوں کے محسوس کرنے سے ملک کی بگڑی ہوئی حالت اور معاشرے کا بکھرا ہوا شیرازہ درست نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے بلکہ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تم اور تمھارے جیسے تمام نوجوان آہنی ارادے کے ساتھ صنعتی اور تجارتی سمندر میں کود پڑیں۔ آہنی ارادے کا دوسرا نام حقیقی دانائی ہے۔ آدمی اگر ایک دفعہ آہنی ارادہ کر لے تو پھر اس کے لیے کوئی مشکل، مشکل نہ رہے گی۔ آہنی ارادہ ہمیشہ فتح یاب ہوتا ہے۔

میرے عزیز بیٹے! شاید تمھیں محسوس ہوتا ہے جیسے تمھاری منزل تم سے روٹھ گئی ہے۔ لیکن نہیں، یہ تمھاری بھول ہے۔ اگر تم دنیا میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو پہلے کامیاب ہونے کا تہیہ کر لو۔ زندگی عمل کا نام ہے اور عمل نصب العین کے بغیر ممکن نہیں۔ اچھا عمل وہ ہے جس کا مقصد بلند ہو۔ ہر کامیاب انسان نے پہلے اپنا نصب العین قائم کیا۔ پھر اس کے حصول کے لیے سخت محنت کرتے رہے۔

دنیا کے کامیاب انسانوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد جو حقائق ہمارے سامنے آئے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اب تک دنیا میں جتنے کامیاب انسان گزرے ہیں اور آج بھی دنیا میں جتنے کامیاب انسان ہیں وہ محض اتفاقی طور پر کامیاب نہیں ہوئے بلکہ ان کے کردار میں کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر ان کو ترقی اور کامیابی حاصل کرنے میں کافی مدد ملی ہے۔

انگلستان کا نامور اہل قلم برناڈ شا جسے اس کی تصانیف نے کروڑ پتی بنا دیا تھا، کامیاب انسانوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''دنیا میں صرف وہی انسان ترقی اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے جو یہ سمجھ لے کہ دنیا تکلیفوں، مصیبتوں اور مشقتوں سے بھری ہوئی ہے اور اس کے بعد وہ مردانہ وار مشکلات کے سمندر میں کود پڑے۔ آرام طلبی کامیابی کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ یاد رکھو دنیا میں صرف وہی انسان کامیاب ہوتا ہے جو دنیا کی راحتوں سے کنارہ کش ہو کر اپنے آپ کو مشکلات اور پھر صعوبتوں کا عادی بنا لے۔ آرام طلبی ایک بڑا گناہ ہے جو شخص بھی اس گناہ کا مرتکب ہوگا وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا خواہ اس کے ذرائع کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ کامیابی صرف ان کا حصہ ہے جو مصیبتوں اور تکلیفوں کو دعوت دیتے ہیں اور کبھی بھی پریشانیوں سے نہیں گھبراتے''۔ آگے چل کر برناڈ شا غریبی اور مفلسی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''غریبی اور مفلسی صرف ان کے لیے ہے جو غریبی اور مفلسی کو دعوت دیتے ہیں۔ مفلسی کو گوارا کر لینا بہت بڑی کمزوری ہے اور جو شخص مفلسی کے سامنے اپنی گردن جھکا لیتا ہے وہ مرتے دم تک مفلس ہی رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ مفلسی کو گناہ خیال کرتے ہیں وہ ہاتھ پاؤں مار کر اس دلدل سے جلد ہی باہر نکل آتے ہیں۔ دنیا کے مشہور موجد اور صناع ابتدا میں مفلس ہی تھے۔ موٹروں کا شہنشاہ ہنری فورڈ ابتدا میں اتنا غریب تھا کہ وہ بمشکل دو وقت روٹی کھا سکتا تھا۔ گراموفون کا مشہور موجد ایڈیسن بھی بالکل مفلس اور قلاش تھا۔ وہ مفلسی سے جنگ کرتا رہا اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چند سال کے اندر ہی نہ صرف مفلسی پر غالب آ گیا بلکہ اس کا شمار دنیا کے بہت بڑے دولت مندوں میں ہونے لگا۔''

امریکہ کا ایک کروڑ پتی کارنگی جس نے ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے ترقی کی، کہتا ہے: ''محنت کامیابی کے خزانے کی کنجی ہے۔ میں سالہا سال تک صرف دو گھنٹے سویا ہوں۔ اسی سخت محنت اور جدو جہد کا نتیجہ ہے کہ میں ایک معمولی مزدور سے ایک بڑا کارخانہ دار بن گیا۔''

میرے عزیز بیٹے! تم اگر مرکزی یا ریاستی سول سروس امتحانات کی تیاری نہیں کر سکتے تو کم از کم کچھ روز صنعتی اور تجارتی اداروں کے ماحول میں رہ کر اپنے آپ میں کاروباری اور تجارتی جذبہ ہی پیدا کرو۔ آنکھیں کھول کر کاروبار کا مطالعہ کرو۔ کیوں کہ کاروباری ماحول ہی سب سے بڑی کاروباری درس گاہ ہے۔ اس ماحول میں رہنے کے بعد سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ تمھیں اپنے لیے کاروبار کے انتخاب میں سہولت ہو جائے گی اور تم اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام تلاش کر سکو گے۔

امریکہ کا ایک کروڑ پتی تاجر رسّل شروع میں ایک پیغام رساں کے فرائض انجام دیتا تھا اور ایک چھوٹے سے کاروباری کے یہاں ملازم تھا۔ چند سال ملازمت کرنے کے بعد اس نے اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کیا اور اپنی محنت، جفاکشی اور نیک کردار کے سبب برابر ترقی کرتا چلا گیا۔ تم یقین کرو کہ جس وقت اس کا انتقال ہوا وہ چالیس ریلوے لائینوں کا مالک تھا۔ اس نے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صنعت وتجارت کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روپے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سے بھی زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ تجارتی سوجھ بوجھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کسی انسان کے پاس ایک پیسہ بھی نہ ہو، صرف تجارتی سوجھ بوجھ ہو تو وہ محنت اور جفاکشی سے ایک دن بڑے سے بڑا تاجر بن سکتا ہے۔''

بظاہر یہ بات عقل سے پرے نظر آتی ہے کہ کوئی بھی انسان روپے پیسے کے بغیر بہت بڑا تاجر کیسے بن سکتا ہے۔ رسّل اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''میرے والدین انتہائی غریب تھے۔ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلا سکتے۔ ابتدائی تعلیم تو میں نے جوں توں کر کے حاصل کر لی لیکن اس کے بعد مجھے تعلیم کا سلسلہ ترک کرنا پڑا کیونکہ مجھے اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں اور والدین کی مالی امداد کرنا ضروری تھی۔ میری تعلیم بس اس قدر تھی کہ میں کسی دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کر سکتا تھا لیکن کوشش کے باوجود جب مجھے کلرکی کی جگہ بھی نہ ملی تو میں نے شہر کے ایک چھوٹے سے کاروباری کے یہاں ایک پیغام رساں کے طور پر ملازمت کر لی۔ یہ ملازمت اگرچہ بہت ہلکے درجے کی تھی لیکن میرے لیے یہ ایک نعمت ثابت ہوئی۔

رسّل نے مزید لکھا کہ: ''چونکہ میں ایک تاجر کے یہاں ملازم تھا اور اس کے کاروباری خطوط ادھر اُدھر پہنچاتا رہتا تھا۔ یہ خطوط زیادہ تر دیگر تاجروں کے پاس لے جانے پڑتے تھے اس لیے مجھے مختلف تاجروں سے ملنے جلنے کا موقع ملتا رہتا تھا اور ہر روز میرے دل میں یہ جذبہ بڑھتا چلا جاتا تھا کہ مجھے بھی کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر میں سرکاری دفتر میں کلرک ہوتا تو بس کلرک ہی رہ جاتا اور ترقی کرنے کا جذبہ مجھ میں کبھی بھی پیدا نہ ہوتا۔ چنانچہ اسی جذبے نے مجھے پیغام رساں کی ملازمت ترک کر کے ایک چھوٹا سا ذاتی کاروبار کرنے کی ترغیب دی اور اس چھوٹے سے کاروبار کو اپنی محنت اور جفاکشی سے بڑھا کر میں ترقی کی بلند ترین منزل پر پہنچ گیا۔''

میرے عزیز بیٹے! آج ہمارے ملک کو ہنری فورڈ، ایڈیسن، کارنگی اور رسّل جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو کامیابی کے میدان میں عزم محکم اور آہنی ارادوں کے ساتھ آگے بڑھیں اور کچھ کر کے دکھائیں۔

پیارے بیٹے! آج سے تم بھی تہیہ کر لو کہ تم منزل کو پانے کے لیے جدو جہد کرتے رہو گے، تمھاری منزل قریب ہے۔ تم حالات کا رخ بدل سکتے ہو کیونکہ تمھارا عزم امڈتا ہوا طوفان ہے جو سمندروں کا راستہ بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔

نوٹ: اس خط کا مطالعہ ہر تعلیم یافتہ بے روزگار شہری کے لیے سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزا ہے۔ (ادارہ)

□□□

Aashiyana
Banauliya, Bihar Sharif
Nalanda - 803101

اردو خبرنامہ

''اردو ادب کے فروغ میں مقبول اور عوامی ادب کا حصہ''
سہ روزہ سیمینار

● نئی دہلی، 17 مارچ۔ ''مقبول ادب نے اردو ادب کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مقبول ادب کے حوالے سے ہمیں اپنے ذہن کو کھولنا چاہیے۔'' ان خیالات کا اظہار غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں دہلی اردو اکادمی کی جانب سے سہ روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں مقررین نے کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس اور نظامت اظہار عثمانی نے کی۔

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے نیشنل کمیشن فار مائنارٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن کے چیئر مین جسٹس محمد سہیل اعجاز صدیقی نے کہا کہ ایک وقت تھا جب اردو ادب پر نوابوں اور رئیسوں کی اجارہ داری تھی اور ادب ان کے لیے محض تفریح کا ذریعہ تھا لیکن آزادی کے بعد حالات بدلے تو سیاسی اور سماجی انتشار سے فرار حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے مقبول ادب کو اپنایا۔ مقبول ادب نے اردو ادب کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ جسٹس صدیقی نے کہا کہ مقبول ادب وہی ہوتا ہے جو وقت کے تقاضوں کو ادبی شکل میں ڈھالے اور جو سماجی تبدیلی کو قبول کرتے ہوئے ادبی روایتوں کے ساتھ ساتھ عصری ادب کو بھی خود سے وابستہ کرے۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ ادب عالیہ اور پاپولر لٹریچر کے درمیان ہمیشہ کشمکش رہی ہے اور مقبول ادب کے قارئین کی تعداد ہمیشہ ادب عالیہ کے قارئین کے مقابلے بہت زیادہ رہی ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ اردو والوں نے ''لوک ادب'' کو مجرمانہ طور پر نظر انداز کیا جب کہ لوک ادب کسی بھی زبان کا بہت قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ ابن صفی نے بہت معیاری ناول لکھے، اظہار اثر کے 800 سے زیادہ جاسوسی ناول ہیں۔ انھیں اردو ادب کا حصہ تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اس سے قبل خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ یہ مقبول ادب کی مقبولیت ہی کی مثال ہے کہ آپ کو دور دراز کے گاؤں تک میں خاتون مشرق، پاکیزہ آنچل یا بیسویں صدی جیسے رسائل مل جائیں گے۔ اس مقبولیت کے باوجود عوامی اور مقبول ادب کو ادب عالیہ کا حصہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ ابن صفی، رضیہ بٹ اور گلشن نندہ جیسے مقبول ترین قلمکاروں کو یہ شرف حاصل نہیں کہ ان کی تصانیف کو ادب عالیہ میں شامل کیا جاتا۔ اس تقریب میں پاکستانی ادیب سبط اختر اور مسلم ٹیچر ٹریننگ سینٹر چیلنی کے پرنسپل سید محمد اسمٰعیل نے بھی شرکت کی۔

سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد محمود نے کہا کہ مقبول اور عوامی ادب کے پڑھنے والے آج بھی 90 فیصد ہیں اور یہ واقعی مقبول عام ادب ہے۔ مجلس صدارت کے رکن ڈاکٹر شریف احمد نے کہا کہ مقبول ادب کا تعلق انسان کے ذوق سے ہے جو محسوس کرنے کی چیز ہے۔ ادب عالیہ میں بنیادی چیز اقدار ہیں جو عوامی اور مقبول ادب میں نہیں ہوتی۔ اس اجلاس میں اظہار اثر نے ''پاپولر لٹریچر: اصول وضوابط''، مشتاق احمد نوری نے ''اردو زبان کے فروغ میں پاپولر لٹریچر کا حصہ'' فاروق بخشی نے ''ادب اور پاپولر لٹریچر: تفریق اور مماثلت'' ڈاکٹر قاسم خورشید نے ''پاپولر لٹریچر اور جاسوسی ناول'' ڈاکٹر راشد انور راشد نے 'پاپولر لٹریچر اور فنون لطیفہ'' اور ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے ''دہلی کے افسانہ نگار: پاپولر لٹریچر کے حوالے سے'' کے زیر عنوان مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے کی۔ دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں زبیر رضوی، منظور عثمانی، پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، اور شاہد ماہلی شامل تھے۔ نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے کی اور اظہار عثمانی نے ''دہلی کے چند رسالے پاپولر لٹریچر کے حوالے سے'' سہیل انجم نے ''اردو الیکٹرانک میڈیا: پاپولر لٹریچر کے حوالے سے''، فاروق ارگلی نے ''اردو مشاعرے پاپولر لٹریچر کے حوالے سے''، ڈاکٹر ابن کنول نے ''اردو داستان اور مقبول ادبی روایت'' اور ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے ''مقبول ادب کے نمائندہ قلمکار'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔

سیمینار کے آخری دن پہلے اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے بلراج کومل نے کہا کہ ادب عالیہ میں اعلیٰ حسیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مقبول عام ادب میں عوامی روایت سے لے کر میڈیا کے رول تک کی باتیں ہوتی ہیں۔ اعلیٰ ادب کو عوام تک پہنچانے کے لیے ہمیں وہ طریقہ استعمال کرنا چاہیے جس سے وہ مقبول ہو۔ مجلس صدارت کے دوسرے ارکان میں پروفیسر شاہد حسین، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر گنگا پرساد ومل شامل تھے۔ اس اجلاس کی نظامت ابو ظہیر ربانی نے کی۔ پروفیسر قمر رئیس نے ''لوک ادب اور پاپولر لٹریچر'' ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے نے 'خانقاہوں میں محفل سماع' ڈاکٹر خالد جاوید نے

''ابن صفی بحیثیت پاپولر ادیب''، ڈاکٹر مولا بخش نے ''پاپولر لٹریچر کی روایت'' ظہیر انور نے ''اردو ڈراما تھیٹر'' اور ابوذر ہاشمی نے ''اردو خواتین ناول نگار پاپولر لٹریچر کے حوالے سے'' کے زیرِ عنوان مقالے پیش کیے۔ آخری اجلاس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور سید ضمیر حسن دہلوی شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اشفاق احمد عارفی نے انجام دیے جب کہ دیویندر اسر نے ''سائنس اور پاپولر لٹریچر'' ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے ''اردو اشتہارات و پوسٹر: پاپولر لٹریچر کے حوالے سے'' اور پریم پال اشک نے ''فلمی نغمہ نگاری اور مقالہ نگاری پاپولر لٹریچر کے حوالے سے'' کے موضوع پر اپنے مقالات پیش کیے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

کثیر لسانی ہم عصر اردو ہندی پر سیمینار

● علی گڑھ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کی جانب سے ''کثیر لسانی ہم عصر اردو ہندی'' کے موضوع پر منعقد قومی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر ایمریٹس مسعود حسین خاں نے کہا کہ اردو داں طبقے کو ہندی اور ہندی داں طبقے کو اردو کا علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں پریم چند جیسے اردو کے عظیم ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے اپنا تخلیقی عمل اردو میں شروع کیا اور ہندی میں بھی لکھا۔ پروفیسر مسعود حسن خاں نے آنند نرائن ملا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کا کہنا تھا کہ وہ مذہب چھوڑ سکتے ہیں مگر اردو نہیں چھوڑ سکتے۔ ممتاز تاریخ داں پروفیسر عرفان حبیب نے زبان کے فروغ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شمالی ہندوستان میں تمام زبانیں قدرتی زبان سے پیدا ہوئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شمالی ہندوستان میں پہلے ہندوی لفظ استعمال کیا جاتا تھا جو تیرھویں صدی سے ہندی کہا جانے لگا۔ انھوں نے کہا کہ مغل دربار میں فارسی کے ساتھ ہندی کے متعدد لفظ استعمال کیے جاتے تھے۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر کے ایم مشرا نے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہندی اور اردو دونوں الگ الگ زبانیں ہیں اور یہ ہندوستان کی سیکڑوں سال قدیم مشترک تہذیب کی امین ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج ماہرین لسانیات کے سامنے زبانوں کو محفوظ رکھنا ہی سب سے بڑا چیلنج ہے۔

اس سے قبل سیمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ آرگنائزنگ سکریٹری پروفیسر اے آر فتیحی نے سیمینار کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شبانہ حمید نے انجام دیے۔ ڈاکٹر مسعود علی بیگ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی عبدالستار نے کی۔ اس میں جناب کے پی سنگھ نے ''انیسویں صدی کا ہندی اردو تنازعہ'' کے عنوان سے خصوصی خطبہ پیش کیا۔ بعد ازاں جناب نجو بھاردواج نے ''میڈیا کا بھاشائی پر پیریکشیہ'' اور جناب خطیب ایس مصطفےٰ نے ''ہندی اخبارات پر اردو کا اثر'' کے زیرِ عنوان مقالے پیش کیے۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی۔ اس میں پروفیسر شریش چودھری نے ''ہندی، اردو یا ہندوستانی۔ ہندوستان کی قومی زبان کا سفر'' کے عنوان سے خصوصی خطبہ پیش کیا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر رضوان قیصر نے ''ہندوستانی — ایک قومی زبان کی تلاش''، رضوان احمد نے ''ایک زبان، دو رسم الخط یا ایک رسم الخط اور دو زبانیں: دیوناگری رسم الخط میں اردو'' پروفیسر سید امتیاز حسنین نے ''اردو کس کی زبان؟''، ڈاکٹر رمیش راوت نے ''قومی زبان کے طور پر ہندی کا ورود اور بھارتیندو''، پروفیسر اے. پی. بیجاپور نے ''ہندی/اردو تعصب اور اردو'' اور'' پروفیسر اے. آر. فتیحی نے ''نہرو کی لسانی پالیسیوں میں تضاد'' کے زیرِ عنوان مقالے پیش کیے۔

چوتھا اجلاس Reconciling Hindi Urdu Diversity کے عنوان سے مباحثے کی شکل میں منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر اقتدار عالم خاں، پروفیسر شریش چودھری، پروفیسر اے. پی. بیجاپور، ڈاکٹر رمیش راوت، ڈاکٹر رضوان قیصر، رضوان احمد اور مسعود علی بیگ نے حصہ لیا۔

پانچواں اجلاس پروفیسر شریش چودھری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں جے شری چکرورتی، سجاد حسین دانی، ڈاکٹر صباح الدین احمد اور پروفیسر آر. بی. مشرا نے مقالات پیش کیے۔ جناب خطیب ایس مصطفےٰ کی صدارت میں منعقدہ چھٹے اجلاس میں ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر فاطمہ بیگم، ڈاکٹر مظفر شہ میری اور ڈاکٹر عزیز احمد خاں نے مقالے پیش کیے۔

ساتویں اجلاس کی صدارت پروفیسر اے. آر. فتیحی نے کی اور ڈاکٹر شبانہ حمید، ڈاکٹر طارق چھتاری، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، پروفیسر نیتا سنگھ، ڈاکٹر رمیش راوت، محترمہ فرح اور سجاد حسین دانی نے مقالات پیش کیے۔ آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر امتیاز حسنین نے کی اور پروفیسر سلیل مشرا نے خصوصی خطبہ پیش کیا۔ (ڈاک سے)

اردو ادب میں طنز و مزاح — قومی سیمینار

● پونہ، 26 فروری۔ حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، بزم اردو اعظم کیمپس، انجمن ترقی اردو ہند شاخ پونہ، غزل اکیڈمی اور رسک مترمنڈل پونہ کے اشتراک سے اعظم کیمپس پونہ کے اسمبلی ہال میں ''اردو ادب میں طنز و مزاح — ماضی، حال اور مستقبل'' کے موضوع پر ایک قومی سیمینار کا انعقاد منور پیر بھائی کی صدارت میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ٹرسٹ کی اعانت سے

اشاعت پذیر ڈاکٹر محبوب راہی کے طنزیہ ومزاحیہ شعری مجموعے '' اٹاپ شاپ'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر جناب شمیم طارق نے اظہار خیال کیا۔ معروف افسانہ نگار محترمہ سلمٰی صدیقی کی صدارت میں اردو طنز ومزاح پر مقالہ خوانی کی دوسری مجلس میں معروف افسانہ نگار نورالحسنین نے '' طنز ومزاح کے ماضی، حال اور مستقبل''، قاضی مشتاق احمد نے '' اردو نثر میں طنز ومزاح''، نذیر فتحپوری نے '' اردو شاعری میں طنز ومزاح''، محترمہ ممتاز پیر بھائی نے '' اردو طنز ومزاح کے تاریخی تسلسل''، سید سعید احمد نے '' اردو ڈرامے میں طنز ومزاح'' نیز محبوب راہی نے '' میں طنز ومزاح کیوں لکھتا ہوں'' کے تحت مقالات پیش کیے۔ مدیر '' شگوفہ'' ڈاکٹر مصطفٰی کمال، مولانا حسن عباس فطرت، محترمہ عابدہ انعامدار اور سریش چندر سورت والا مہمانانِ خصوصی تھے۔

تیسری مجلس کی صدارت اردو طنز ومزاح کے اکلوتے ماہنامے '' شگوفہ'' حیدرآباد کے مدیر ڈاکٹر مصطفٰی کمال نے کی جس میں مولانا حسن عباس فطرت نے '' کان''، مشتاق مدنی نے '' کیشن کلچر''، عباس متقی نے '' کچرا''، اسد رضا نے '' ادب میں سیاست''، پرویز اللہ مہدی نے '' فلم نیک پروین اول''، فیاض احمد فیضی نے '' مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری پر پیروڈی مقدمہ فلمی شاعری'' اور محترمہ سلمٰی صدیقی نے '' جب میں سولہ سال کی تھی'' کے عنوانات سے تخلیقات پیش کیں۔ (ڈاک سے)

سیمینار '' پنڈت نہرو کا لسانی وژن۔ اردو کے خصوصی حوالے سے''

● نئی دہلی، 18 مارچ۔ قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین جناب محمد حامد انصاری نے کہا کہ ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ملک میں اردو کو ختم کرنے کی عملی کوششوں پر بہت فکرمند تھے اور چاہتے تھے کہ جس طرح دوسری زبانوں کی ترقی ہو رہی ہے اسی طرح اردو کی بھی ترقی ہو۔ انھوں نے ان خیالات کا اظہار اردو یونیورسٹی اور سینٹر فار جواہر لال نہرو اسٹڈیز کی جانب سے منعقدہ ایک سیمینار '' پنڈت نہرو کا لسانی وژن'' ۔ اردو کے خصوصی حوالے سے'' کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین نے کہا کہ پنڈت نہرو نے وزرائے اعلیٰ کو 16 جولائی 1953 اور یکم اگست 1953 کو لکھے خطوط میں اردو کے ساتھ برتے جانے والے سلوک پر اظہار افسوس کیا تھا۔ جناب حامد انصاری نے کہا کہ موزوں پالیسی بنائے بغیر اردو کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے یو۔ پی اور بہار میں اردو کی خستہ حالی پر بھی افسوس کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ زبان کو زندہ رکھنا اہل زبان کا کام ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہودیوں کی مثال پیش کی کہ کس طرح انھوں نے اپنی زبان کو زندہ رکھا۔ انھوں نے اہل اردو پر زور دیا کہ وہ اپنے گھروں میں بچوں کو اردو ضرور پڑھائیں۔

منصوبہ بندی کمیشن کی رکن سیدہ حمید نے مولانا آزاد کی تصنیف '' غبار خاطر'' اور محمد یونس کی تصنیف '' قیدی کے خط'' کے حوالے سے کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو اگرچہ مغربی تعلیم کے پروردہ تھے مگر انھیں اردو سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو کو دیگر زبانوں کی مانند ترقی ملے اور اس کو اس کا جائز حق اور مقام ملے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی ضرورت ہے اور منصوبہ بندی کمیشن میں اس پر غور ہو رہا ہے کہ اردو کو روزگار اور روزی روٹی سے کیسے جوڑا جائے۔

اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اردو طلبہ کو بھی سرکاری ملازمت اور دیگر زبانوں کے طلبہ کی مانند مراعات دی جائیں۔ اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے۔ایم۔ پٹھان نے یو پی اور مدھیہ پردیش میں اردو کی حالت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ یو پی کے لوگ ہندی اخبار پڑھتے ہیں اور ہندی اخبار میں اردو یونیورسٹی کا اشتہار دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے اردو یونیورسٹی جلد ہی پیشہ ورانہ کورسیز شروع کرنے جا رہی ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ اردو کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ہے۔ اول یہ کہ حکومت کو اردو کی ترقی کے لیے مجبور کیا جائے اور دوم، ہم اردو والے خود اردو کے لیے کام کریں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ہمارا وجود اردو سے وابستہ ہے اردو نہیں تو ہم بھی نہیں۔ اس موقعے پر اردو یونیورسٹی دہلی مرکز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شاہد پرویز نے اردو یونیورسٹی کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جب کہ فاصلاتی نظام تعلیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کے آر اقبال احمد نے مہمانوں کا تعارف کرایا اور پروفیسر الطاف اعظمی، پروفیسر گنگا پرساد ومل، پروفیسر نصیر احمد خاں، ڈاکٹر مشرا، ڈاکٹر رضوان قیصر، ڈاکٹر آر۔ کے۔ بھٹ، (پرنسپل پبلیکیشن آفیسر قومی اردو کونسل)، پروفیسر شمیم حنفی، فیضی عذیر ہاشمی، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور دیگر حضرات نے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر وسیم بیگم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

('' قومی آواز'' دہلی)

بہادر شاہ ظفر کے مزار پر صدر جمہوریہ کی حاضری

● رنگون، 9 مارچ۔ '' میں نہ صرف صدر جمہوریۂ ہند بلکہ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اس عظیم شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے آیا ہوں جس نے پہلی جنگ آزادی کی قیادت کے علاوہ اردو شاعری کی بھی آبیاری کی۔'' ان

خیالات کا اظہار صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر کیا جہاں انھوں نے اپنی طرف سے چادر چڑھائی اور فاتحہ پڑھی۔ ڈاکٹر عبدالکلام نے کہا کہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ کس کسمپرسی میں مغل بادشاہ نے رنگون میں اپنی بیوی کے ساتھ آخری دن کیسے گزارے۔ اپنے وطن کی محبت ان کی شاعری میں ٹپک رہی ہے۔

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

جب ڈاکٹر عبدالکلام بہادر شاہ ظفر کے مزار پر پہنچے تو سیکڑوں لوگوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور بہادر شاہ ظفر ٹرسٹ کے منتظمین نے صدر کو مغل بادشاہ کی آخری آرام گاہ کے بارے میں تفصیلات پیش کیں۔

بہادر شاہ ظفر نے مئی 1857 میں رانی جھانسی، بیگم حضرت محل اور دوسرے راجاؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ انگریزوں نے ان کے خلاف مقدمہ چلایا اور فروری 1858 میں انھیں ملک بدر کر دیا۔ بادشاہ کے ساتھ ان کی بیوی زینت محل بھی رنگون آئیں۔ منتظمین نے صدر کو بتایا کہ بہادر شاہ ظفر کو جب یہاں سپاہیوں کی نگرانی میں لایا گیا تو ان کو ایک گیراج میں رکھا گیا جو ایک انگریز فوجی افسر کے بنگلے کے ساتھ تھا اور آخر 7 نومبر 1862 کو مختصر علالت کے بعد یہیں انتقال کر گئے۔

بہادر شاہ ظفر کے مزار کے بارے میں انگریز حکمرانوں نے کسی کو بھی نہیں بتایا اور اس راز کو 30 برس تک چھپائے رکھا لیکن جب بیگم زینت محل کا 1886 میں انتقال ہوا تو لوگوں کو اس کے بارے میں پتہ چلا کیونکہ ان کو بہادر شاہ ظفر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آزادی کے بعد حکومت ہند نے اس مقبرے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لی۔ اب یوم جمہوریہ اور یوم آزادی کے موقعے پر ہندوستانی سفارت خانے کا عملہ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر تقریبات کا اہتمام کرتا ہے۔ ("قومی آواز" دہلی)

"اقبال کی عظمت" پر سیمینار

● کانپور۔ "علامہ اقبال ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کے یہاں فکری بلندی کے تمام پہلو پائے جاتے ہیں" پروفیسر شارب ردولوی نے حلیم مسلم پوسٹ گریجویٹ کالج میں منعقدہ سیمینار "اقبال کی عظمت کے اسباب" میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال در اصل ایک بیدار ذہن، حساس اور فردا بیں شاعر ہیں۔ وہ پہلے شاعر ہیں جس نے ماضی کی عظیم ادبی و شعری روایتوں کے ساتھ ساتھ مغرب کے علمی نظریات، فلسفیانہ فکر اور سیاسی تبدیلیوں سے بھی استفادہ کیا۔ پروفیسر خورشید احمد نے کہا کہ اقبال کی عظمت کا راز یہ ہے کہ ان کے بعد آنے والے ہر بڑے شاعر نے ان کی پیروی کی۔ چاہے وہ ن م راشد ہوں یا اختر الایمان۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ اقبال نے جس عہد میں آنکھ کھولی وہ مشرق کے زوال اور مسلمانوں کے انحطاط کا زمانہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اہل مشرق بالخصوص مسلمان اپنی روایتوں اور عظمت رفتہ سے محروم ہو چکے ہیں۔ اقبال نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے اور اس کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کے لیے ہمارے سامنے انسان کامل کا تصور پیش کیا۔ انسان کامل ان کے نزدیک وہ ہے جو اسلامی تعلیمات کا پیرو ہے۔ اور اسلامی تعلیمات کا ماخذ چوں کہ قرآن ہے اس لیے قرآن کے اندر ہی انسان کامل موجود ہے۔ اقبال نے اس مکمل انسان کے لیے ضروری جانا کہ وہ خودی اور عشق کے اوصاف سے متصف ہو کیوں کہ خودی انسان کو اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے اور انھیں بروئے کار لانے کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اور عشق انسان کو عمل پر اکساتا ہے۔ اقبال نے عشق کو عقل پر اسی لیے فوقیت دی ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ اقبال کی شاعری میں زندگی کے تمام پہلو ملتے ہیں۔ انسان ہی اقبال کی شاعری کا مرکز و محور ہے۔ معروف ادیب جناب نامی انصاری نے کہا کہ اقبال کا سب سے بڑا وصف ان کی شاعرانہ قوت ہے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فکر و فلسفے کو جذبے کی زبان عطا کی اور اسے تمام لوگوں کے لیے دلکش اور قابل توجہ بنا دیا۔

جناب عشرت ظفر نے کہا کہ حالانکہ انھیں شاعر کی حیثیت سے زیادہ جانا جاتا ہے لیکن انھوں نے نثر میں جو کچھ بھی لکھا وہ بھی کم اہمیت کی چیز نہیں۔

کالج کے پرنسپل پروفیسر اشفاق حسین نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اقبال بڑے شاعر اسی لیے ہیں کہ وہ عوام و خواص میں یکساں پسند کیے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے سیمینار کے کنوینر خان احمد فاروق نے کہا کہ اقبال دنیائے ادب کا واحد شاعر ہے جس نے پانچ تہذیبوں کو جوڑتے ہوئے اپنی شاعری پیش کی۔ اقبال کو کسی ملک، فرقے، مذہب یا کسی مخصوص فکر و فلسفے کے حوالے سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ انھیں صرف ایک شاعر کی حیثیت سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مہ لقہ خاتون صدیقی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

''میرا: شخصیت اور فن'' سیمینار

● اودے پور، 27 فروری۔ گورنمنٹ میرا گرلس کالج، اودے پور، راجستھان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور راجستھان اسٹیٹ مائنس اینڈ منرلس لمیٹیڈ، اودے پور کے اشتراک سے دو روزہ کل ہند سیمینار 26-27 فروری کو بعنوان ''میرا: شخصیت اور فن'' منعقد کیا گیا۔ پانچ اجلاسوں پر مشتمل اس سیمینار کے افتتاحی جلسے کی صدارت پروفیسر نند چترویدی نے کی اور مہمان خصوصی پروفیسر سید محمد عقیل رضوی تھے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر شاہد مالی تھے اور کلیدی خطبہ پروفیسر قمر رئیس نے پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ثروت خاں نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ ہم ہندی کے عظیم شعرا کو بھلائے بیٹھے ہیں جب کہ ان کی زبان پر عربی فارسی کے اثرات صاف دیکھے جاسکتے ہیں انھوں نے کہا کہ میرا کا تصور عشق ماورائیت کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہندی اور اردو والے مل کر ایک ایسا نصاب تیار کریں جس میں ہمارے کلاسیکی شعرا کو دونوں زبانوں میں پڑھایا جاسکے۔

پروفیسر چترویدی نے کہا کہ ہمارے کلاسیکی ادب کے درخشاں ستاروں کو نئے تناظر میں پڑھنے، سمجھنے اور ان کے پیغام کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ میرا کے کلام کو محض بھگتی بھاؤ سے اپنانے کا وقت نہیں ہے بلکہ اضطراب و انتشار کے اس دور میں اس عظیم شاعرہ کے بنائے ہوئے دائروں، حلقوں اور درجات کو عالمی تناظر میں دیکھنے، پرکھنے کی ضرورت ہے۔

تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر کلیان سنگھ شیخاوت نے کی۔ میرا کی حیات اور ادبی خدمات پر مشتمل اجلاس میں ڈاکٹر شاہد مالی، پروفیسر علی احمد فاطمی ڈاکٹر نگار عظیم اور ڈاکٹر انجو چترویدی نے اپنے مقالے پیش کیے۔

(ڈاک سے)

اردو کانفرنس

● علی گڑھ، 28 فروری۔ ''اردو زبان کی ترقی اردو کی تعلیم سے وابستہ ہے جب تک اردو کی تعلیم کا صحیح بندوبست ابتدائی سطح سے نہیں ہوگا تب تک اردو زبان اور اردو صحافت کی ترقی نہیں ہوسکتی۔'' علی گڑھ کی زراعتی و صنعتی نمائش واقع دربار ہال میں منعقد چھٹی سالانہ اردو کانفرنس میں معروف ادیب اور انکم ٹیکس کمشنر جناب سید محمد اشرف نے اس خیال کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں جتنی ہندوستانیت ہے وہ کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ آج وقت کی ضرورت ہے کہ اردو کی بقا کی لڑائی ہندی کے لوگوں کو ساتھ لے کر لڑی جائے۔ انھوں نے کانفرنس کے کنوینر اور انڈین اردو جرنلسٹ ایسوی ایشن کے قومی صدر جناب مبین خاں کی کوششوں کی تعریف کی۔

صدر جلسہ جناب دویک بنسل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اردو کے فروغ کے لیے تمام لوگوں سے آگے آنے کی اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ صوبے میں اردو کی بہت سی آسامیاں خالی پڑی ہیں انھیں جلد از جلد پُر کیا جائے۔ ایسوی ایشن کے سکریٹری محمد احمد نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو فوری طور پر نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔ جلسے میں پروفیسر اقبال احمد اور ظہیر ساحل نے بھی مخاطب کیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر شکیل ہمدانی نے کی۔ (ڈاک سے)

مالیرکوٹلہ میں ادبی جلسہ

● مالیر کوٹلہ، 19 فروری۔ ''ایک قابلِ رشک صحت مند سماج کے لیے مقصدی ادب کی آبیاری اور نشو و نما از حد ضروری ہے تاکہ پرامن بقائے باہم اور پُرمسرت لمحاتِ حیات کا حصول ہو سکے۔ شہر اردو مالیرکوٹلہ میں ان مساعی جمیلہ کا عکس صاف نظر آ رہا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار مرکزی وزارت ترقی انسانی وسائل کی جانب سے چلنے والے ادارے ناردرن ریجنل لینگویج سینٹر پٹیالہ کے پرنسپل ڈاکٹر غضنفر علی نے مالیرکوٹلہ میں ادارہ ادب اسلامی، پنجاب اور ہم عصر پنجاب کے زیر اہتمام منعقدہ ادبی اجلاس میں بطور مہمانِ خصوصی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر محمود عالم نے کی اور نظامت رمضان سعید نے کی۔

جلسے میں محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے اپنا افسانہ 'ملن' خالد کفایت نے انشائیہ بعنوان 'داڑھی' سالک جمیل براڑ نے ایک افسانچہ 'ضرورت' اور ڈاکٹر غضنفر علی نے اپنا علامتی افسانہ 'سانڈ' سامعین کی نذر کیا۔ سماجی رسومات، بندھنوں، کوتاہیوں، محرومیوں اور مجبوریوں کے موضوع پر لکھا گیا یہ افسانہ بے حد پسند کیا گیا۔ بعد ازاں شعر و شاعری کا دور چلا جس میں ڈاکٹر غضنفر علی، ظفر احمد ظفر، محمد اسرار، محمد انور، افتخار شیخ، مکرم صفی اور پروفیسر محمود عالم نے اپنا کلام پیش کیا۔

(ڈاک سے)

یوم اردو کا انعقاد

● ''نئی دہلی، یکم اپریل۔ اردو ہندوستان کی واحد ایسی زبان ہے جو قومی سطح پر مقبول ہے۔ اور ملک کے ہر خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔'' ان خیالات کا اظہار نیشنل اردو فورم کے صدر ڈاکٹر انور پاشا نے یوم اردو کے

موقعے پر جے این یو میں منعقدہ ایک جلسے میں کیا۔ واضح ہو کہ 31 مارچ کو ملک گیر سطح پر یوم اردو کے طور پر منایا جاتا ہے کیونکہ 31 مارچ کو ہی اتر پردیش میں اردو کو اس کا جائز حق دلوانے کے لیے بھوک ہڑتال پر بیٹھے پنڈت دیو نرائن پانڈے نے اپنی جان کی قربانی دی تھی۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ اردو کبھی نہیں مر سکتی۔ اس کو مارنے کا دعویٰ کرنے والے سیاستداں خود ہی مرکھپ گئے۔ پروفیسر ناز قادری نے کہا کہ متعصب ذہن والے اگر اردو کو ایک فرقے کی زبان تصور کرتے بھی ہیں تب بھی اردو کو اس کے جمہوری حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ اردو ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے اور جس زبان کا رشتہ ہمارے خون سے ہو وہ بھلا ہمارے جیتے جی کیسے مر سکتی ہے۔ اس جلسے کو پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر شکیل احمد خاں، ہشام الدین فاروقی کے علاوہ کئی ممتاز دانشوروں نے خطاب کیا۔

سلام بن رزاق کے اعزاز میں جلسہ

● پٹنہ۔ سلام بن رزاق کی ممبئی سے عظیم آباد تشریف آوری پر شوکت حیات کی رہائش گاہ پر عظیم آباد کے ادبا، شعرا کی ایک نشست ممتاز نقاد پروفیسر وہاب اشرفی کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ جناب شوکت حیات نے سلام بن رزاق کا استقبال کرتے ہوئے اردو افسانے کی تاریخ اور ارتقا کے حوالے سے 1970 کے بعد کے افسانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ممبئی میں سلام بن رزاق، انور قمر، قمر احسن، انور خاں، ساجد رشید اور بہار میں شوکت حیات، حسین الحق اور شفق اردو افسانہ کے اس اہم تخلیقی موڑ کے گواہ قرار دیے گئے۔ سلام بن رزاق نے اپنی کہانی ''استفراغ'' سنائی۔ خورشید اکبر نے اپنے خطاب میں ''استفراغ'' کو سلام بن رزاق کا ایک نہایت کامیاب افسانہ قرار دیا۔

شان الرحمٰن نے سلام بن رزاق کی متعدد تحریروں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے تاثرات پیش کیے، انھوں نے سلام بن رزاق کے ریڈیائی پروگرام ''پکارا'' کا ذکر کیا۔ اور اس موقعے پر صفدر امام قادری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ سلام بن رزاق کے افسانے احتجاج سے شروع ہوتے ہیں لیکن زندگی کی دھوپ چھاؤں میں ان کے کردار بالآخر مصلحتوں کا شکار ہو جاتے ہیں یا وقت انھیں اپنی مٹھی میں قید کر لیتا ہے۔ ان کے کردار اقدار سے ضرور ٹکراتے ہیں لیکن آخر میں وہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ جناب سلام بن رزاق نے شرکائے محفل کا شکریہ ادا کیا۔ اس نشست کی نظامت صفدر امام قادری نے کی اور محترمہ ارشاد پروین کے شکریے کے ساتھ اس کا اختتام ہوا۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

اردو ریفریشر کورس

● حیدرآباد۔ ''اردو میں تدریس کا معیار بلند کیے بغیر اردو زبان و ادب کی ترقی ناممکن ہے۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر اے ایم پٹھان وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے شعبۂ اردو کی جانب سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے اشتراک سے 7 تا 27 مارچ کو منعقدہ اردو کے پہلے ریفریشر کورس کی اختتامی تقریب میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ پروفیسر پٹھان نے کہا کہ ملک بھر میں قائم 48 اکیڈمک اسٹاف کالجوں میں تدریس کے عصری طریقوں سے استفادہ، متعلقہ مضامین کی ماہرانہ ترسیل، انتظامی امور کی انجام دہی کی خصوصی تربیت اور شخصیت سازی پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

پروفیسر خالد سعید نے کورس کی تفصیلی رپورٹ پیش کی اور کہا کہ تدریس کے عصری طریقوں سے روشناس کروانے کے مقصد سے فکشن کے موضوع پر منعقد اس پہلے ریفریشر کورس میں توسیعی خطبے، مائیکرو ٹیچنگ، کمپیوٹر کلاس، اور تعلیمی تفریح کے علاوہ افسانوی و شعری نشستیں بہت کامیاب رہیں۔ ڈاکٹر کے آر اقبال احمد ناظم و صدر شعبۂ فاصلاتی تعلیم اور پروفیسر ایس اے وہاب قیصر، کنٹرولر امتحانات نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ اس ریفریشر کورس کے شرکا شاد عثمانی، ڈاکٹر آمنہ تحسین، ڈاکٹر حامد اشرف، ڈاکٹر نسیم الدین فریس اور ڈاکٹر محمد قاسم امام الدین، نے تین ہفتوں پر مشتمل اس کورس کے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے۔ (''سیاست'' حیدرآباد)

اردو، کنڑ، اردو لغت: ورکشاپ

● بنگلور۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنی شاخ جنوبی ہند حیدرآباد کو اردو، کنڑ، اردو انگریزی سہ لسانی لغت کی تیاری کا ایک اہم منصوبہ تفویض کیا ہے۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے کنڑ، اردو، انگریزی ادب کے ماہرین پر مشتمل ایک مجلس ترتیب دی گئی ہے جس میں جناب رگھوتم راؤ دیسائی (سابق رکن کرناٹک اردو اکادمی) جناب خلیل احمد (سابق رجسٹرار کرناٹک اردو اکادمی) پروفیسر عبدالمجید خاں، ڈاکٹر چامراج، جناب جلال الدین، ڈاکٹر منجولا، پروفیسر سید شہاب الدین شامل ہیں۔ اس منصوبے کا پہلا پانچ روزہ

ورکشاپ حیدرآباد میں 23 تا 27 فروری منعقد کیا گیا جس کا افتتاح جناب ایس موہن ڈائرکٹر اور ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، پرنسپل پبلیکیشن آفیسر قومی اردو کونسل نے کیا۔ اس پانچ روزہ نشست میں حرف الف پر مشتمل 773 الفاظ کو حتمی شکل دی گئی۔ 20 تا 26 مارچ کو دوسرا ورکشاپ ادارہ الامین بنگلور کی لائبریری میں منعقد ہوا۔ افتتاحی نشست سے خطاب کرتے ہوئے جناب مصطفیٰ ندیم خاں غوری ریسرچ آفیسر، قومی اردو کونسل نے شرکا کا خیر مقدم کیا اور اب تک کیے گئے کاموں کی روداد پیش کی۔ جناب رگھوتم راؤ نے اس لغت کی غرض و غایت سے واقف کرایا۔ ("سالار" بنگلور)

صابر دت کی یاد میں جلسہ

● پنچکولہ۔ "صابردت اُردو کے ایسے شاعر اور ادیب تھے، جنھوں نے صلے کی پروا کیے بغیر اُردو ادب کی خدمت کی حالانکہ وہ فلمی دنیا سے وابستہ تھے لیکن اپنی تحریروں کو انھوں نے فلمی انداز سے محفوظ رکھا۔" چودھری وریندر سنگھ وزیر خزانہ، ہریانہ نے ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے ہریانہ کے شاعر اور ادیب صابردت کی یاد میں منعقدہ تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے اعلان کیا کہ صابردت کے نام سے اکادمی کی جانب سے قومی سطح کا ایک ایوارڈ شروع کیا جائے گا جس کے لیے حکومت ہریانہ ہر ممکن تعاون دے گی۔ اس سے قبل اکادمی کے سکریٹری کشمیری لال ذاکر نے مہمانوں اور شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی کے ذریعے ایسے قلمکاروں کی ادبی خدمات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے، جنھوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو نئی سمت و رفتار عطا کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ صابردت باغی ذہن کے انسان تھے۔ اس موقعے پر جن دانشوروں نے مقالے پڑھے ان میں شاہد ماہلی، نند کشور وکرم، پروفیسر کملیش موہن، کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر فرزانہ نسیم شامل ہیں۔ شمس تبریزی نے نظامت کے دوران صابردت کی اہم نظمیں اور غزلیں پیش کیں۔ (ڈاک سے)

جشن اردو

● مالیگاؤں، 19 فروری۔ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ مالیگاؤں اور ادارہ نثری ادب کی جانب سے "جشن اردو بہ اعزاز سلطان سجانی" کا انعقاد عمل میں آیا۔ معروف افسانہ نگار، شاعر اور مصور سلطان سجانی کی نصف صدی پر محیط ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں پریم چند ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر فیروز حیدری نے جلسے کی صدارت کی اور مہمان خصوصی افسانہ نگار جناب م ناگ (فیچر ایڈیٹر روزنامہ "تعمیر ہند") اور افسانہ نگار جناب ایم مبین تھے۔

ابتدا میں انجمن کے جنرل سکریٹری خیال انصاری نے انجمن کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ سلطان سجانی کی تمام کتابوں کی نمائش کا آغاز ڈاکٹر منظور حسن ایوبی اور عتیق احمد کمال نے کیا۔ مشہور شخصیت احمد کریم سیٹھ نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر فیروز حیدری، پروفیسر عبدالحفیظ انصاری، الحاج جمیل احمد کرانتی، ڈاکٹر منظور حسن ایوبی، ماسٹر محمد فاروقی، رشید آرٹسٹ، م ناگ، شبیر ہاشمی، احمد عثمانی، اسحاق خضر، ڈاکٹر الیاس صدیقی اور ڈاکٹر اشفاق انجم نے اپنے مضامین میں سلطان سجانی کی افسانہ نگاری، شاعری اور مصوری پر اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر صاحب اعزاز سلطان سجانی نے اپنا ایک منتخب افسانہ پیش کیا نیز اپنے اعزاز پر انجمن ترقی اردو، ادارہ نثری ادب اور تمام معاونین و محبان کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

اسلوب احمد انصاری کو ڈی لٹ

● علی گڑھ، 24 مارچ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کو دین دیال اپادھیائے یونیورسٹی گورکھپور نے انگریزی اور اردو ادب میں ان کی گراں قدر خدمات پر ڈی لٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری گذشتہ کئی دہائیوں سے انگریزی اور اردو ادب میں مسلسل تخلیقی عمل میں مصروف ہیں۔ ("راشٹریہ سہارا" دہلی)

قمر رئیس کو میکش ایوارڈ

● آگرہ، 22 جنوری۔ ادبی انجمن "بزم میکش" کی جانب سے پروفیسر قمر رئیس کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں میکش ایوارڈ برائے 2005 سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ مہمان خصوصی پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، سابق صدر شعبۂ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی اور بزم کے سرپرست سید اجمل علی شاہ اور بزم کے صدر حکیم سید مرغوب الزماں نے پیش کیے۔

ایوارڈ آف آنر سماجی و فلاحی خدمات کے لیے آگرہ کی ماہر امراض چشم ڈاکٹر نور جہاں ساجد کو دیا گیا۔ بزم کی جنرل سکریٹری ڈاکٹر نسرین بیگم نے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر قمر رئیس کا تعارف پیش کیا اور بزم میکش کی گذشتہ سال کی رپورٹ پیش کی۔ اس موقعے پر "میکش اکبرآبادی ـــ فن اور شخصیت" پر سیمینار منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر سراج اجملی، نے "میکش اکبرآبادی اور مسائل تصوف" ڈاکٹر امتیاز احمد نے میکش اکبرآبادی ـــ اور نقد اقبال" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ پروفیسر قمر رئیس نے تصوف کے

میدان میں میکش کی خدمات کا جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ میکش صاحب کی شخصیت کا غیر فانی نقش آج بھی قائم ہے۔ وہ اردو ادب اور ہندوستان کے تاریخی شہر آگرہ کی نمایاں شخصیت تھے۔ سیمینار کے بعد آگرے کے درجہ پانچ سے ڈگری کلاس تک اردو مضمون کے ساتھ اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ و طالبات کو اسناد و انعامات دیے گئے۔ جلسے کی صدارت حکیم سید مرغوب الزماں، صدر بزم میکش نے کی۔ نظامت کے فرائض بزم کی جنرل سکریٹری ڈاکٹر نسرین بیگم نے انجام دیے۔ سید اجمل علی شاہ نیازی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

محمد خلیل کو قومی سائنس ایوارڈ

● نئی دہلی۔ ''سائنس کی دنیا'' کے سابق مدیر محمد خلیل کو گذشتہ دنوں سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبۂ سائنس ٹکنالوجی کمیونیکیشن کونسل، حکومت ہند نے بچوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کو مقبول کرنے کے لیے ان کی نمایاں کوششوں کے اعتراف میں نیشنل ایوارڈ پیش کیا ہے۔ یہ ایوارڈ میڈیا کی معروف شخصیت جناب کرن کارنک (صدر نسکام) نے قومی یوم سائنس کے موقع پر دیا۔ یہ ایوارڈ ایک مومینٹو، سند اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ محمد خلیل کو اسوا آنر، وگیان بھاسکر اعزاز، غالب ایوارڈ، دہلی اردو اکادمی اور یوپی اردو اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ **(ڈاک سے)**

دہلی اردو اکادمی انعامات

● نئی دہلی، 14 مارچ۔ اردو اکادمی دہلی کا سب سے بڑا اعزاز ''بہادر شاہ ظفر ایوارڈ'' مبلغ ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے کا جو کل ہند سطح پر ادب کی مجموعی خدمات کے لیے دیا جاتا ہے معروف ادیب اور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو پس از مرگ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو تحقیق و تنقید کا ایوارڈ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر عبدالحق کو، نثر کا ایوارڈ افسانہ نگار ڈاکٹر نگار عظیم کو، شاعری کا ایوارڈ استاد الشعرا نصرت گوالیاری کو، 2005 کا صحافتی ایوارڈ راشٹریہ سہارا (اردو) کے سراج نقوی کو، ترجمے کا ایوارڈ معروف شاعرہ و ادیبہ محترمہ بلقیس ظفیر الحسن کو، لسانی یکجہتی کا ایوارڈ جناب مدن گوپال کو، بہترین استاد کا ایوارڈ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل اسکول کے پرنسپل جناب محمد معروف خاں کو، نیز بہترین استانی کا ایوارڈ محترمہ کنیز وارثی کو اور کتابت/خطاطی کا ایوارڈ جناب شفیق الرحمٰن کو دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یو۔این۔آئی کی اردو سروس کو اردو صحافت کے فروغ کے لیے نمایاں خدمات انجام دینے پر ایوارڈ برائے فروغ صحافت کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ یہ تمام ایوارڈ مبلغ اکیس ہزار روپے، شال، مومینٹو اور سند پر مشتمل ہیں۔

(''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

دہلی اردو اکادمی انعامات برائے کتب

● نئی دہلی، 13 مارچ۔ دہلی اردو اکادمی نے 2005 کی بہترین کتابوں پر انعامات کا اعلان کر دیا ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ اکیاون سو روپے کے انعامات کے لیے منتخب کتابیں: ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ: جونپور کی ادبی خدمات: تاریخ کی روشنی میں (تاریخ و تنقید)، ڈاکٹر مجیب احمد خاں: کارگہہ شیشہ گری (تنقید)، ڈاکٹر محمد نوشاد عالم: ادبی شناخت (تنقید)، ڈاکٹر اشوک پٹواری: کچھ لمبے کچھ سائے (افسانہ)، مشرف عالم ذوقی: پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سنامی (ناول)، ڈاکٹر تابش مہدی: کنکر بولتے ہیں (شاعری)، مجتبیٰ حسین: آپ کی تعریف (طنز و مزاح)، اسد رضا: چاندی نگر کی سیر (بچوں کا ادب)، ایم اے قریشی: یوگا کی سائنس اور صحت (صحت عامہ)

پینتیس سو روپے کے انعام کے لیے منتخب کتابیں: اقبال انصاری: با! (افسانہ)، زینب نقوی: عزم زینب (سوانح)، ڈاکٹر برق پونچھوی: برق وشرر (شاعری)، اے آر کاردار: یہ اندر کی بات ہے (ڈراما)

دو ہزار روپے کے انعامات کے لیے منتخب کتابیں: محمد خلیل: انوکھے پرندوں کی کہانی (سائنس)، عادل اسیر: گنجا نامہ (بچوں کا ادب) اس کے علاوہ ناشرین سے موصول کتابوں کی بنیاد پر منشی نول کشور انعام برائے بہترین ناشر کے لیے مکتبہ ''پیام تعلیم'' اور ''غالب اکیڈمی'' کو اکیاون سو روپے کے نقد انعامات دیے گئے۔ **(''راشٹریہ سہارا'' دہلی)**

کبیر یادگاری خطبہ

● نئی دہلی، 7 مارچ۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں دوسرے کبیر یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ ''ہندوستانی فارسی پر ہندوی کے اثرات'' کے موضوع پر ملک کے مشہور و معروف مورخ اور دانشور پروفیسر عرفان حبیب نے نہایت معلوماتی اور فکر انگیز خطبہ پیش کیا۔ صدر شعبہ پروفیسر شاہد حسین نے پروفیسر عرفان حبیب و دیگر معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اسکول آف لینگویجز کے ڈین پروفیسر امر باسو نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کبیر میموریل لیکچر کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ ممتاز ترقی پسند نقاد پروفیسر محمد حسن نے جلسے کی صدارت کی۔ یہ پروگرام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقد کیا

گیا تھا۔ پروگرام کے اختتام پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے پرنسپل پبلی کیشنز، آفیسر ڈاکٹر آر. کے. بھٹ نے مہمانان ودیگر شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

جلسہ تقسیم اسناد

● گلبرگہ، 24 فروری۔ قومی اردو کونسل کی جانب سے انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے زیر اہتمام چلائے جا رہے سال 05-2004 میں ایک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی. پی کورس اور اردو ڈپلوما کورس کے کامیاب طلبہ کے لیے جلسہ تقسیم اسناد، خواجہ بندہ نواز ایوانِ اردو میں منعقد ہوا۔

اس موقعے پر ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین نے کہا کہ جدید علوم فنون سے واقفیت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں ایمانداری سے کام کرنا چاہیے۔ جدید علوم کی جانکاری کے بغیر آج کا نوجوان ترقی نہیں کرسکتا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو جاننے والے نوجوانوں کو اپنے طور پر روزی پیدا کرنے والے فنون کی تربیت کے لیے سارے ملک میں کمپیوٹر سینٹروں کے قیام کے ذریعے ایک نیا رجحان دیا ہے۔

جناب ریاض احمد جوائنٹ کمشنر کمرشیل ٹیکس گلبرگہ نے کہا کہ اردو کی ترقی، اردو کی تعلیم میں مضمر ہے۔ اردو پڑھنے والے طلبہ اردو کے ساتھ ساتھ وہ تمام علوم حاصل کریں جو زندگی میں ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ جناب شریف احمد قریشی (صدر انجمن) نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو داں طبقے سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو مادری زبان کے ذریعے تعلیم دلوائیں اور انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے تعلیمی فنڈ کو اپنے گرانقدر عطیات سے مستحکم کریں۔

سال 05-2004 میں ایک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کورس اور اردو ڈپلوما میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والی طالبہ زینب فاطمہ بنت حنیف محمود کو اسناد کے علاوہ خصوصی شیلڈ اور ایک ہزار روپے نقد بطور انعام دیا۔ جناب خواجہ پاشاہ انعامدار معتمد انجمن نے خیر مقدم کیا۔ جناب ولی احمد نائب صدر و چیئر مین مانیٹرنگ کمیٹی کمپیوٹر سینٹر نے کمپیوٹر سینٹر کے قیام اور اس کی کارکردگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور جلسے کی کارروائی چلائی۔ طلبہ کی نمایاں کامیابی کے لیے مہمانانِ خصوصی و صدر انجمن نے جناب ظہیر احمد خاں سوپروائزر، جناب عبدالباسط سینئر لکچرر اور نازیہ بیگم لکچرر کی محنت کی ستائش کی اور مبارکباد دی۔ جناب مجیب احمد (معتمد تنظیمی) کے شکریے پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

دہلی یونیورسٹی میں دو روزہ ادبی و ثقافتی مقابلہ

● نئی دہلی، 16 مارچ۔ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی اور دہلی اردو اکادمی کے اشتراک سے دو روزہ انٹر یونیورسٹی ادبی وثقافتی مقابلہ منعقد کیا گیا، جس میں مضمون نگاری، غزل سرائی، بحث و مباحثہ، فی البدیہہ تقریر، بیت بازی، مونو ایکٹنگ، مائم اور ممکری کے شعبے میں طلبہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ مقابلے کا افتتاح پروفیسر عبدالحق اور صدارت ڈاکٹر ابن کنول نے کی۔ نظامت ممتاز عالم نے کی۔ دو روزہ مقابلے کی مجلس صدارت میں پروفیسر صادق، ڈاکٹر ذکیہ انجم، ڈاکٹر توقیر احمد خاں، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر ارجمند آرا اور ڈاکٹر نجمہ رحمانی شامل تھے۔ مضمون نگاری میں محمد ارشد اول، نور عالم اور شاذیہ سعید نے دوم اور فرح سعید نے سوم، غزل سرائی میں مرزا اطہر ضیا نے اول، رجنی ورما نے دوم اور فرحت کمال نے سوم، بحث و مباحثہ میں جواد عالم گنگی اول، محمد آدم دوم اور اسرار احمد سوم، فی البدیہہ تقریر میں محمد آدم اول، محمد ارشد دوم اور اسرار احمد نے سوم مقام حاصل کیا۔ بیت بازی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اول، دہلی یونیورسٹی دوم اور میرٹھ یونیورسٹی نے سوم جب کہ بیت بازی کی انفرادی کارکردگی میں رضوان احمد اول، عفت ذکیہ دوم اور دانش نے سوم مقام حاصل کیا۔ مائم میں محمد آدم اول اور محمد تنویر دوم رہے۔ ممکری میں فرحان بیگ اول، محمد انس دوم اور عباس سوم رہے۔ مونو ایکٹنگ میں محمد آفاق اول، محمد تنویر عالم دوم اور محمد آدم سوم رہے۔ نتائج کا اعلان بزم ادب کے نگراں ڈاکٹر محمد کاظم نے کیا۔ عارف اشتیاق نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

غبار خاطر کی ڈرامائی پیش کش

● ممبئی۔ کسی ادبی شہ پارے کی ڈرامائی تشکیل میں حد درجہ احتیاط، ہنر مندی، ارتکاز اور تجربہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بہتر طور پر اسی وقت ممکن ہو پاتا ہے جب فن پارے کو ڈرامائی خاکے کا روپ دینے والا فنکار اسٹیج پیشکش کے اسرار و رموز کے ساتھ ساتھ ادبی شہ پارے کی اہمیت و افادیت سے بھی بخوبی واقف ہو۔ گذشتہ دنوں معروف ڈراما نگار اور کالم نویس اقبال نیازی نے مولانا آزاد کے یوم وفات پر ''غبار خاطر'' کے عنوان سے ایک ڈرامائی پیشکش کے ذریعے یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس کا اسکرپٹ اقبال نیازی نے ہی تحریر کیا تھا اور وہی اس کے ہدایت کار بھی تھے۔ ڈرامے میں قلعہ احمد نگر میں اسیری کے دوران مولانا آزاد کے لکھے گئے خطوط کے مجموعے ''غبار خاطر'' سے سات اہم اور دلچسپ خطوط کا انتخاب کر کے اسے ڈرامائی شکل دی گئی۔

خطوط کے درمیانی حصوں میں راوی کی مدد سے کچھ بیانیہ حصے جوڑے گئے جن میں مولانا آزاد کی عظیم المرتبت شخصیت، ان کے مزاج اور شگفتہ بیانی کے ساتھ ساتھ ''غبار خاطر'' کی علمی ادبی حیثیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ مولانا آزاد کا کردار رفیق گلاب نے نبھایا۔ انیسہ انصاری نے راوی کے علاوہ بوا امانی اور بیگم زلیخی، عارف شیخ نے راوی کے علاوہ ڈاکٹر سید محمود اور مولوی ملیح آبادی اور معین اقبال نے مولانا آزاد کے بچپن کا کردار ادا کیا۔ مہاراشٹر کے متعدد اسکولوں اور کالجوں میں یہ ڈراما اسٹیج کیا جا رہا ہے۔ اگر مزید کوئی اسکول یا کالج اس ڈرامے کا شو کرنے کے خواہش مند ہوں تو وہ کردار آرٹ اکیڈمی (ممبئی) میں اقبال نیازی سے اس نمبر پر رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔
09324337503/09323186007 (ڈاک سے)

اردو طلبہ کے لیے گیان وانی کا تعلیمی پروگرام

● نئی دہلی، 10 مارچ۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے زیر اہتمام دہلی کے اردو اسکولوں کے طلبہ کے لیے گیان وانی دہلی کے ایک تعلیمی پروگرام کا سلسلہ 6 مارچ سے شروع کیا گیا ہے۔ پروگرام کے انچارج سید سجاد رضوی کے مطابق ''دبستان اردو'' کے عنوان سے یہ پروگرام سنٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے نصاب کے 9ویں تا 12ویں جماعت کے طلبہ کے لیے ہے اور اس کے تحت سائنس، ریاضی، سماجی سائنس، کامرس، اردو، ہندی اور انگریزی جملہ مضامین پر مبنی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام ایف.ایم 105.6 پر صبح گیارہ بجے اور شام 4 بجے سنا جا سکتا ہے۔

گیان وانی جو اوپن یونیورسٹی کا چینل ہے، ابتدائی جماعت سے لے کر یونیورسٹی سطح تک کے طلبہ کے لیے پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ماہرین تعلیم بھی اس پروگرام میں فون کال کے ذریعے طالب علموں کو درپیش مسائل کا حل بتاتے ہیں۔ (''قومی آواز'' دہلی)

مختصرات

● مالیر کوٹلہ۔ افسانہ کلب کی ماہانہ افسانوی نشست کی صدارت افسانہ کلب و ادبی سنگم مالیر کوٹلہ کے صدر جناب محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے کی۔ جلسے میں اسحاق احمد نے اپنا انشائیہ ''موبائل فون'' پڑھ کر سنایا۔ جنرل سکریٹری افسانہ کلب سالک جمیل براڑ نے اپنا افسانہ ''ازراہ ثواب'' خالد کفایت نے اپنا طنزیہ و مزاحیہ مقالہ ''پہنچی وہیں پہ خاک....'' پیش کیا۔ آخر میں بشیر مالیر کوٹلوی نے اظہار خیال کیا۔ نظامت کے فرائض سالک جمیل براڑ نے انجام دیے۔

● کانپور، 7 مارچ۔ معروف ادیب علیم صبا نویدی کی کانپور تشریف آوری کے موقع پر متعدد ادبی انجمنوں کی جانب سے ان کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر فاروق جائسی نے کہا کہ علیم صبا نویدی کی تہہ در تہہ شخصیت میں علم و ادب کے وہ دریا موجزن ہیں جو تشنگان ادب کو نسل در نسل سیراب کرتے رہیں گے۔ نویدی صاحب نے تخلیقی تنقیدی اور تحقیقی سطح پر تن تنہا قابل قدر کام کیا ہے۔ علیم صبا نویدی صاحب کی شخصیت اور فن پر غلام مرتضی راہی۔ عشرت ظفر مدیر ''خرام'' کانپور، ناظر صدیقی، ضیا فاروقی، مولانا میکائل ضیائی، مولانا محمد قاسم، سید وسیم الحسن قاسمی، سلیم عنایتی، نواب حسین اور یاور وارثی نے گفتگو کی۔ اس نشست کی صدارت جناب علیم صبا نویدی نے کی اور نظامت ضیا فاروقی نے کی۔ (ڈاک سے)

● رڑکی، 21 مارچ۔ رڑکی مشاعرہ کمیٹی کی جانب سے ''ایک شام افضل منگلوری کے نام'' سے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت او.ایس.ڈی وزیر اعلیٰ، وزیر مملکت لئیق احمد نے کی۔ منوہر لال شرما، قاضی معین الدین سابق وزیر اور سورج مل صدر بسپا کمیٹی اترانچل نے مہمانان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ نظامت کے فرائض انور جلال پوری نے انجام دیے۔ مشاعرے میں منور رانا، وسیم بریلوی، طارق قمر، رئیس انصاری، مظفر رزمی کیرانوی، معراج فیض آبادی، کنور بیچین، تنویر غازی، وسیم راجپوری، شیاما سنگھ صبا، افضل منگلوری، خوشبو مظفر نگری، حامد بہرائچی، جہاز دیوبندی، راج گوپال سنگھ راج، حق کانپوری، ندیم نیر، شائستہ ثنا، ریاض ساغر، اسلم کھتولوی، سرور کمال سجاد جھنجھٹ، کوثر کیرانوی، آصف نظر، حسن کاظمی، ڈاکٹر دیویندر کافر، ایاز احمد ایاز اور عالم لکھنوی نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازا۔
(''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

● سیتا پور۔ بزمِ اردو سیتا پور کی جانب سے ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت اقبال محشر رائے بریلوی نے کی اور نظامت مشاعرے کے کنوینر رضوان خاں نے کی۔ مشاعرے میں اقبال محشر رائے بریلوی، تسنیم فاروقی، مست حفیظ رحمانی، اشتیاق علی صبا، خالد علوی، دبیر سیتا پوری، فہیم فاروقی، شارق لاہر پوری، رضوان خان، منظر یسین، طارق قمر، ڈاکٹر شمر سنبھلی، تشنہ عالمی، یونس لکھنوی، عرفان لکھنوی، عارف محمد عارف، عمران سیتا پوری، شکیل ملانوی، صابر حسن پوری، محفوظ رحمانی، خالد فتحپوری، بدر سیتا پوری، سردار گیان سنگھ پدم اور دیگر شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● ناگپور۔ ماہنامہ ''اردو میلہ'' ناگپور کی جانب سے گذشتہ دنوں معروف شاعر معراج فیض آبادی کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا انعقاد شوکت علی ہال، محمد علی سرائے، مومن پورہ، ناگپور میں کیا گیا جس کی صدارت بزرگ شاعر شریف احمد شریف نے اور نظامت محمد غلام رسول اشرف نے کی۔ ابتدا میں ''اردو میلہ'' کے ایڈیٹر انصاری اصغر جمیل نے معراج فیض آبادی کا مختصر تعارف پیش کیا۔ معراج فیض آبادی نے ناگ پور سے اپنی والہانہ وابستگی اور محبت کا اظہار کیا۔ سینٹرل تنظیم کمیٹی کے صدر حاجی عبدالقدیر مہمان خصوصی تھے۔ معراج فیض آبادی، شریف احمد شریف، منظور ندیم، ظفر کلیم، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، خضر ناگپوری، اسحٰق اکمل، محمد غلام رسول اشرف، رجب عمر، جاوید ندیم اور نعیم انصاری نے اپنا کلام سنایا۔ (ڈاک سے)

● حیدرآباد۔ شاعر و ادیب جناب شاغل ادیب کی پچاس سالہ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک تہنیتی تقریب بزمِ یکتا کی جانب سے زیر صدارت مدیر ''خوشبو کا سفر'' جناب صلاح الدین نیر 23 فروری کی شام انعقاد پذیر ہوئی۔ مہمانانِ خصوصی و مقررین میں ڈاکٹر راہی، بصیر افضل، فیاض شکیب اور نادر المسدوسی شامل تھے جنھوں نے موصوف کی شخصیت و فن پر مقالے پیش کیے۔ بعد ازاں جناب اثر غوری کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ جس میں فیض الحسن خیال، اجمل محسن، سلیم عابدی، حلیم بابر کے علاوہ صلاح الدین نیر، یوسف یکتا، ڈاکٹر راہی، شاغل ادیب، رشید جلیلی، مسرور عابدی، بصیر افضل، فیاض شکیب، یوسف روش، نادر المسدوسی، شوکت علی درد، خلش جگری اور محبوب علی محبوب وغیرہ نے کلام سنایا۔ مشاعرہ کی نظامت ڈاکٹر راہی نے انجام دی۔ آخر میں یوسف یکتا نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● حیدرآباد، 21 فروری۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر مجید بیدار کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ریاستی زبان کمیشن کی تحریک ڈاکٹر وائی ایس راج شیکھر ریڈی وزیر اعلیٰ ریاست آندھرا پردیش نے ''یوم عالمی مادری زبان'' کا ایوارڈ دیا۔ ڈاکٹر مجید بیدار گذشتہ 27 سال سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور انھوں نے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ دکنی تذکرے ناول اور متعلقاتِ ناول، صوتی درس، خونی جادوگر، (بچوں کا ادب) اور حال ہی میں ''نثری بیانیہ'' جیسی کتابیں تحریر کر کے ادبی دنیا میں منفرد شناخت بنائی ہے۔ انھوں نے بارھویں جماعت کی نصابی کتاب ''یووک بھارتی'' کلیاتِ وجد'' جمالِ ابھتا جلالِ ہمالہ'' کے علاوہ ''آبادی تعلیم'' اور ''ڈھولک کے گیت'' وغیرہ کتابیں مرتب کیں۔ (ڈاک سے)

● جمشید پور، 21 مارچ۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے صحافت، افسانہ اور تنقید کے شعبوں میں اہم خدمات انجام دی ہیں ان کی قیادت میں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کا شعبۂ اردو تیزی سے ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔ پروفیسر سید احمد شمیم نے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے اعزاز میں منعقدہ جلسے میں اس خیال کا اظہار کیا۔ معروف شاعر اسلم بدر نے کہا کہ ''اسلم جمشید پوری کی کہانیاں اپنی جڑوں سے گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ افسانہ نگار انور امام نے کہا کہ اسلم جمشید پوری کے افسانے آس پاس کی زندگی کے عکاس ہوتے ہیں۔ صدر محفل پروفیسر ساغر برنی نے اسلم جمشید پوری کو فکشن کی تنقید میں نئی نسل کا ایک اہم نقاد بتایا۔ جلسے کی نظامت منظر کلیم نے کی۔ جلسے میں پروفیسر جوہر بلیاوی، ڈاکٹر افسر کاظمی، تنویر اختر رومانی، رضوان احمد، معشوق احمد اور سید عباس رضا رضوی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسلم جمشید پوری نے جمشید پور سے اپنے گہرے قلبی لگاؤ کا اظہار کیا اور دو مختصر افسانے، ''مجھے معاف کر تارام سنگھ'' اور ''مشین کا پرزہ'' سنائے۔

(ڈاک سے)

● بھوپال۔ 18 مارچ، 17 مارچ کی شام ملا رموزی سنسکرتی بھون میں اردو اکیڈمی بھوپال کی جانب سے ادبی نشست کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں بزرگ شاعر جناب وحید پرواز، جناب رہبر جونپوری اور محترمہ فیروزہ یاسمین نے شرکت کی۔

اردو اکیڈمی کے ڈپٹی سکریٹری جناب اقبال مسعود نے ابتدائی کلمات پیش کیے۔ محترمہ یاسمین نے اپنا افسانہ ''آپ کیوں شرمندہ ہیں'' پیش کیا، جو ہندو مسلم بھائی چارے کے موضوع پر لکھا گیا تھا۔ ان کے بعد رہبر جونپوری نے اپنی نظمیں سنائیں۔ پروفیسر آفاق احمد، انور حسین، اقبال مسعود، نسیم انصاری، رشید انجم، امتیاز انجم اور ظفر نسیمی نے بحث میں حصہ لیا۔ آخر میں چیئرمین مدھیہ پردیش اردو اکادمی بشیر بدر نے اظہار خیال کیا۔ سکریٹری اکادمی کے شکریے پر جلسے کا اختتام ہوا۔ (''ندیم'' بھوپال)

رسم اجرا

اردو میں نفسیاتی تنقید

● بھیونڈی، 12 فروری۔ اسلامک سوشل اینڈ کلچرل فورم کی جانب سے صمدیہ ہائی اسکول میں صحافی شمیم طارق نے ڈاکٹر غلام نبی مومن کی مرتبہ کتاب ''اردو میں نفسیاتی تنقید'' کی رسم اجرا ادا کی۔ فورم کے سکریٹری ڈاکٹر

غیاث الدین اور محمد حسن فاروقی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے فورم کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ اقبال عثمان مومن نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ جان عالم رہبر اور محمد حسن فاروقی نے کتاب کے موضوع کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نے اپنے مقالے میں کہا کہ مرتب نے تنقیدی مضامین کے ترتیبی مرحلے میں صرف شاعری کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے جب کہ اردو ادب میں بہت ساری ایسی اصناف ہیں جو آج بھی توجہ طلب ہیں اور تنقید و تجزیہ کی متقاضی ہیں۔ ناقد سلیم شہزاد نے کہا کہ یہ کتاب ادبی تنقید کی ایک خاص سمت میں تخلیقی قدر پیمائی کرنے والے ایک درجن مضامین کا مجموعہ ہے جو اس کے مرتب کی تنقیدی بصیرتوں کا آئینہ دار ہے۔

شمیم طارق نے کہا کہ پہلا نقاد دراصل خود تخلیق کار ہوتا ہے۔ تنقید بہت ہی ذمہ داری کا کام ہے۔ تنقید کا مقصد قاری اور خالق کے درمیان رابطہ قائم کرانا ہوتا ہے۔ تنقید نگار کا کام فیصلہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ ایماندارانہ تجزیہ پیش کرنا ہوتا ہے اور یہی کام نفسیاتی تنقید کرتی ہے۔ جلسے کی صدارت علی ایم شمسی نے کی اور مہمانِ خصوصی ڈاکٹر محمود حسن تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر غلام نبی مومن نیتمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اقبال عثمان مومن کے اظہارِ تشکر پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ امیر حمزہ ثاقب نے جلسے کی نظامت کی۔ (ڈاک سے)

رنگ زندگی کے

● نئی دہلی۔ ''اسٹیج ڈرامے زندگی اور عام آدمی کی مشکلات اور پریشانیوں کی ترجمانی کرتے ہیں اور ڈراما نویس اپنے ڈراموں کے ذریعے دیکھنے والوں پر حقیقی تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تاثرات پچھلے دنوں بیسویں صدی کی پانچویں تا ساتویں دہائی میں اسٹیج ڈراموں کی دنیا میں غیر معمولی شہرت کی بلندیوں پر رہنے والے ڈراما نویس یوگ راج کے اسٹیج ڈراموں کے مجموعے ''رنگ زندگی کے'' کی رسم اجرا کے موقع پر پیش کیے گئے۔ اپنے عہد کے ممتاز ڈراما نگار، ہدایت کار اور تھری آرٹ کے روحِ رواں رومیش مہتا نے کتاب کی رسم اجرا ادا کی۔ ممتاز ڈراما نگار ریوتی شرن شرما تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ دیگر اہم شرکا میں ممتاز اردو نقاد قمر رئیس، رومیش چندر، سی ڈی. سدھو، رویل سنگھ، ہرمندر کمار اور دوسری اہم شخصیات شامل تھیں۔

(''قومی آواز'' دہلی)

ہماری آواز

● میرٹھ 30 مارچ۔ ''ڈاکٹر انجم جمالی کا شمار میرٹھ کے ان شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی جہت دی اور نہ صرف روایت کی پاسداری کی بلکہ اسے نئے آہنگ سے آشنا کرایا۔'' ان خیالات کا اظہار ممتاز شاعر و ادیب جناب مخمور سعیدی نے شعبۂ اردو کی ششماہی میگزین ''ہماری آواز'' کے گوشۂ ڈاکٹر انجم جمالی کے اجرا کے موقع پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر جمالی کی مجموعی خدمات کی بازیافت کر کے شعبۂ اردو نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ تقریب کی صدارت ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر جے. کے پنڈیر نے کی۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے خیر مقدمی تقریر کی۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ جمالی کی شعری بصیرت کئی نسلوں کو متاثر کرتی رہے گی۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست بھی منعقد کی گئی جس میں مخمور سعیدی، ڈاکٹر مولا بخش، بھارت بھوشن، نظیر میرٹھی، ڈاکٹر مشتاق صدف، ادیٰ مشق آبادی، شعیب رضا وغیرہ شامل تھے۔

(''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

جانے والوں کی یاد

ہنومان سنگھل

● ٹونک۔ پچھلے دنوں اردو اور ہندی کے معروف ادیب اور صحافی ہنومان سنگھل کا ان کے آبائی وطن ٹونک میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر لگ بھگ 65 سال تھی۔

ہنومان سنگھل نے اردو اور ہندی میں کئی کتابیں لکھیں اور کچھ کتابیں مرتب بھی کیں۔ انھیں اپنے شہر سے بہت لگاؤ تھا اور ان کی تصنیفی سرگرمیوں کا مرکز زیادہ تر ٹونک ہی رہا۔ انھوں نے ٹونک کی تاریخ بھی لکھی اور اس شہر کی تاریخ اور اس کی تہذیبی اور تمدنی زندگی پر کہی گئی نظموں کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا۔ وہ اپنے والد جناب رام نواس ندیم کی یاد میں ایک جریدہ بھی ''ندیم'' کے نام سے نکالتے رہے۔ کچھ مدت پہلے انھوں نے ان کا مجموعۂ کلام بھی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ ان کی موت اچانک ہوئی اور ان تمام لوگوں کو سوگوار کرگئی جو انھیں کسی نہ کسی وسیلے سے جانتے تھے۔

فرید احمد

● دہلی۔ فرید بکڈپو کے مالک فرید احمد کا 16 مارچ کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔ انھوں نے بڑے پیمانے پر مختلف النوع موضوعات پر اردو کتابیں شائع کیں۔ مرحوم بے حد منکسر المزاج تھے۔ دو سال قبل ممبئی میں بھی انھوں نے فرید بکڈپو کی ایک شاخ قائم کی تھی۔ مرحوم خریداروں سے بھی بڑی خوش مزاجی سے گفتگو کرتے اور نئی کتابیں نصف قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ انھوں نے ممبئی والوں میں ایک بار پھر کتب بینی کا ذوق بیدار کر دیا اور لوگ جوق در جوق کتابیں خریدنے لگے تھے۔

□□□

تبصرہ وتعارف

کلیات مصحفی (جلد چہارم) رپہ تصحیح: نثار احمد فاروقی
صفحات: 389، قیمت: -/216 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ارشد علی خاں

شیخ غلام ہمدانی مصحفی اپنے زمانے کے بہت پر گو شاعر تھے۔ ان کا مولد امروہہ کے مضافات میں ایک چھوٹا سا گانو اکبر پور تھا لیکن ان کی تعلیم و تربیت امروہہ میں ہوئی۔ اکیس بائیس سال کی عمر میں 1184 ھ میں انھوں نے امروہہ کو خیر باد کہا اور غالباً پہلے دہلی آئے، پھر ٹانڈہ چلے گئے جہاں نواب محمد یار خاں امیر کا دربار صاحبانِ کمال کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ نواب موصوف کے دربار تک مصحفی کی رسائی کا وسیلہ کون بنا، قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے لیکن وہاں قائم چاند پوری پہلے سے موجود تھے۔ مصحفی نے وہاں انھی کے ساتھ قیام کیا۔ یہ محفل برہم ہوئی تو وہ دہلی آ گئے اور پھر بارہ تیرہ سال یہیں رہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہاں کسی بڑے رئیس یا شاہی دربار تک ان کی رسائی نہ ہو سکی اور یہ ساری مدت انھوں نے تنگدستی اور افلاس میں گزاری۔ ان کا یہ مقطع اسی زمانے کا کہا ہوا لگتا ہے:

ہے خانہ نشیں مصحفی افلاس کے مارے
کیا پوچھو ہو اس بے سرو سامان کی اوقات

خود دہلی اور دہلی کے امرا ان دنوں کس زبوں حالی کے شکار تھے اس کا اندازہ مصحفی کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

دلّی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلے، سنسان گھر پڑے ہیں

حال یہ سرکاروں کا اب کے امیروں کی ہے
دیگچے بیکار ہیں، سرد پڑے ہیں ایاغ

اے مصحفی مودی کو لوں ٹوک تو وہ مجھ سے
کہتا ہے کہ ہاتھی بھی سرکار کے بھوکے ہیں

دلّی میں وسائل معاش کی کمی سے دل برداشتہ ہو کر مصحفی نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہاں انھیں کسی قدر فارغ البالی ضرور نصیب ہوئی، ان کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہو گیا لیکن نوابی دربار سے انھیں وہاں بھی کچھ زیادہ فیض نہ پہنچا، اس کی ایک وجہ اس دربار کے طور طریق کے تئیں ان کی ناپسندیدگی بھی تھی۔ خود لکھتے ہیں:

اے مصحفی مت کر ہوسِ مجلسِ آصف
معلوم نہیں ہے تجھے دربار کا انداز

نثار احمد فاروقی مرحوم جو مصحفی کے ہموطن تھے، انھوں نے کئی سال پہلے ان کا کلیات کئی جلدوں میں مرتب کر کے علمی مجلس دلی سے شائع کرا دیا تھا لیکن اس کے بعد بھی وہ مصحفی کے حالات اور ان کے کلام کی جمع آوری کے کام میں منہمک رہے اور اس کام میں انھیں قومی اردو کونسل کا تعاون بھی حاصل ہو گیا۔ کونسل کے مالی تعاون سے انھوں نے کلام مصحفی کی ترتیب و تدوین کا کام از سرِ نو انجام دیا۔ کونسل نے فاروقی صاحب کی مرتب کردہ تین جلدیں ان کی زندگی میں شائع کر دی تھیں، اب چوتھی جلد جو دیوان چہارم پر مشتمل ہے، شائع کی گئی ہے۔ صحتِ متن کے علاوہ فاروقی صاحب کے مرتب کردہ کلیات کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مشکل الفاظ کے معنی حاشیے میں درج کر دیے گئے ہیں۔ یہ الفاظ اور محاورے یا تو مقامی نوعیت کے ہیں، یا اب استعمال میں نہیں رہے ہیں یا استعمال میں ہیں تو محل استعمال بدل گیا ہے۔ یہ کام فاروقی صاحب جیسا وسیع المطالعہ اور باخبر شخص ہی انجام دے سکتا تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصحفی نے اپنے ہر اہم پیشرو یا ہم عصر شاعر کی آواز میں آواز ملانے کی کامیاب کوشش کی ہے لیکن ان کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ یہ خیال جزوی طور پر شاید درست ہو کہ مصحفی کے ہاں بعض پیشروؤں اور ہم عصروں کی آوازوں کی بازگشت سنی جا سکتی ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کی کوئی انفرادی آواز نہ ہو۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ ان کے اپنے محسوسات و مشاہدات کا عکاس ہے اور یہاں ان کا اپنا لہجہ بھی صاف سنا جا سکتا ہے۔ اس لہجے میں جو محزونی ہے وہ شاعر کے نجی تجربات کی دین ہے اور یہ تجربات ایک ایسے شاعر کے ہیں جس نے گرد و پیش کی زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ محسوس کیا ہے۔

جامعہ کی کہانی/ عبدالغفار مدھولی
صفحات:469، قیمت:-/140 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عطاء الرحمٰن قاسمی

جامعہ کی کہانی عبدالغفار مدھولی مرحوم کا دلچسپ اور معلوماتی روزنامچہ ہے، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس 1920 سے 1947 تک کی 27 سالہ مدت پر محیط ہے۔ عبدالغفار مدھولی صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر محمد مجیب اور پروفیسر عابد حسین کے رفیق مشن اور جامعہ کے ابتدائی دور کے معلم و مربی تھے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں پروفیسر مشیرالحسن، پروفیسر محمد مجیب اور پروفیسر اختر الواسع کے تاثرات شامل ہیں، مدھولی صاحب نے پہلے سال کی رپورٹ میں قیام جامعہ کے اسباب و محرکات کا ذکر کرتے ہوئے سنگ بنیاد کے موقع پر شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا کی جامع تقریر کا ذکر کیا ہے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ'' جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔ علاوہ ازیں اس میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی کی مساعی جمیلہ کا ذکر شامل ہے، دوسرے سال کی تعلیمی رپورٹ میں فاؤنڈیشن کمیٹی، اور دوسری کمیٹیوں بالخصوص نصاب کمیٹی کے فیصلوں کی تفصیل ملتی ہے۔ نصاب کمیٹی میں ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبیر احمد عثمانی اور آزاد سبحانی کا نام آتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی شخصیات نصاب جامعہ کی ترتیب میں شریک رہی ہیں۔ شیخ الجامعہ کے لیے ڈاکٹر محمد اقبال کا نام پیش کیا گیا، لیکن ان کی طرف سے معذرت کرنے کے بعد مولانا محمد علی جوہر کو شیخ الجامعہ منتخب کیا گیا۔ تیسرے سال کی رپورٹ میں جامعہ پر رفتہ رفتہ تعلیمی رنگ چڑھنے کا ذکر ہے۔ چونکہ جامعہ کے قیام میں سیاسی رنگ غالب تھا۔ چوتھے سال 1924 میں دستور جامعہ کی ترتیب اور اس کے اغراض و مقاصد کے تعین سے متعلق واضح اشارے ملتے ہیں۔ اور پانچویں سال میں مسلمان بچوں کے لیے دینیات اور ہندو بچوں کے لیے ہندو اخلاقیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ اور یہ قومی نوعیت کی قابل تقلید دانش گاہ کے لیے خصوصی اہمیت رکھتی ہے، اور آج بھی جامعہ کا یہی طرۂ امتیاز ہے۔ اس باب میں جامعہ کے طلبہ کی بزم آرائیوں و سخن طرازیوں کے ساتھ ساتھ جامعہ کے اساتذہ کا کام بھی سامنے آتا ہے، بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ قیام جامعہ کے دوران مولانا محمد حسین محوی لکھنوی نے تاریخ فیروز شاہی اور مولانا محمد مسلم آبادی نے المنجد کا ترجمہ کیا تھا۔ اول الذکر ترجمہ 1947 کے حوادث کی نذر ہو گیا۔ علاوہ ازیں طلبہ کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے جامعہ سے متعدد ادبی اور مزاحیہ رسالے بھی نکلتے رہے ہیں اور ان میں طلبہ کے چھوٹے چھوٹے مضامین چھپتے تھے۔ اس باب میں جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی میں منتقل کرنے کا مسئلہ بھی تفصیل کے ساتھ زیر بحث آیا ہے جس کے بارے میں گاندھی جی بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ اسی موقعے پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے جرمنی سے خط لکھا تھا کہ ہمارے آنے تک جامعہ کو بند نہ کیا جائے۔ حکیم اجمل خاں صاحب کی دور اندیشی اور خصوصی تعاون کے باعث جامعہ بند نہیں ہو سکا۔

اسی طرح چھٹے، ساتویں، آٹھویں اور نویں سال میں بھی جامعہ کی تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں اور قومی لیڈروں کی آمد اور ان کی تقریروں کی تفصیلی رپورٹ ملتی ہے اور اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ گاندھی جی نے اپنے پوتے کو جامعہ میں حصول تعلیم کے لیے بھیجا تھا اور ان کا انتقال ہو گیا تو گاندھی جی جامعہ میں آئے اور لڑکوں کو دیکھ کر کہا کہ غم دور کرنے کے لیے یہ بچے بہت ہیں۔ مہاتما گاندھی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ جامعہ ملیہ کے ساتھ، اسلامیہ نہ رہا تو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

دسویں سال 1930 میں ڈانڈی نمک ستیہ گرہ، سول نافرمانی اور نہرو کمیٹی رپورٹ جیسے قومی مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں جن سے جامعہ اور اساتذۂ جامعہ کسی نہ کسی حد تک متاثر بھی رہے ہیں۔ قیام جامعہ کے گیارھویں سال میں منجانب جامعہ اساتذہ کی ٹریننگ، طلبہ کی باغبانی اور تیراکی کی خصوصی تربیت شروع کی گئی اور ماہرین فن کے ذریعے طلبہ کی جسمانی و ذہنی تربیت کی جانے لگی۔ یہ تربیت کسی بھی دانشگاہ کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے۔ اس سال جامعہ کی ترقی و استحکام کے لیے متعدد تجاویز منظور ہوئی تھیں، یہ تمام مباحث روزنامچہ میں موجود ہیں۔ اسی سال مشہور قومی رہنما پنڈت موتی لال نہرو کی وفات ہوئی اور اسی سال پنڈت جواہر لال نہرو جامعہ میں آئے، جہاں ان کا شاندار استقبال ہوا۔

بارھویں، تیرھویں، چودھویں، پندرھویں، سولھویں، اٹھارھویں اور انیسویں

سال میں بھی گذشتہ برسوں کی طرح طلبہ کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی پر پوری توجہ دی جاتی رہی۔ بیسویں سال میں اساتذہ اور جامعہ کے طلبہ کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ ہر استاد اور طالب علم کے لیے ذاتی کھاتہ ہو جس سے معلوم ہو سکے کہ سال بھر میں کس نے کتنی کتابیں پڑھیں۔ بیت الحکمۃ میں امام شاہ ولی اللہ کا فلسفہ اور قرآن مجید کی تفسیر پڑھانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر اور درمیان میں بانیان جامعہ، اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ قدیم عمارتوں کی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں جو بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ جامعہ کے ماضی و حال سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ مختصراً یہ کہ جامعہ کی کہانی جامعہ کی تاریخ اور اس کے نصاب تعلیم اور اس کے اساتذہ و طلبہ کی محنت اور جفاکشی پر یہ ایک مستند کتاب ہے اور اس کے بیشتر واقعات کے شاہد خود مصنف ہیں۔

ہندوستان: سرزمین اور عوام/سنارائی گپتا
مترجم: ایس کے سنگھ
صفحات: 70، قیمت: -/30 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ایس اے رحمٰن

اس کتاب میں بطور خاص بچوں کے لیے ہندوستان کے بارے میں خاصی اہم معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب کا عنوان 'ہمارا وطن' ہے اور اس میں ہندوستان کی سرزمین کو پہاڑوں وادیوں، دریاؤں اور صحراؤں کا حیرت انگیز سلسلہ بتایا گیا ہے جہاں کروڑوں انسان عرصۂ دراز سے رہتے بستے آئے ہیں۔ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جس کا رقبہ دس لاکھ مربع میل ہے جب کہ آبادی سو کروڑ سے زیادہ ہو چکی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ہندوستان بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک ہے لیکن صنعت و حرفت کے میدان میں بھی اس نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ یہاں مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے لوگ رہتے ہیں جس سے ملک میں سیکولر قدروں کو مضبوطی ملی ہے۔ ہندوستان کی سرزمین نے مختلف ادوار دیکھے ہیں، راجاؤں مہاراجاؤں کا زمانہ رہا تو حملہ آوروں سے اس کا واسطہ پڑا۔ مغل آئے تو حملہ آور بن کر مگر یہیں رچ بس گئے اور یہاں کی تہذیب و ثقافت کا حصہ بن گئے۔ ان کے بعد انگریزوں کا زمانہ آیا۔ 1947 سے ہندوستان ایک آزاد جمہوری ملک ہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

دوسرے باب کا موضوع "ہمارے طبقات" جس میں ہندوستانی عوام کے بارے میں بتایا گیا ہے اور ان کی مذہبی، تہذیبی اور سماجی قدروں کی وضاحت کی گئی ہے۔ انسانیت اور انسانی رشتے، ذات پات، مذہب، عقیدے اور تہذیبی ضابطوں اور رسم و رواج سے بلند ہوتے ہیں، اسی لیے ہندوستان پوری دنیا میں اپنی سیکولر جمہوریت کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ تیسرے باب کا موضوع "ہمارا تمدن" ہے جس میں تہذیبی اور سماجی قدروں کے ساتھ ملک کے فنون و ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رقص، سنگ تراشی، مصوری، فن تعمیر، عوامی رقص اور زبان و ادب ہندوستانی تمدن کا ناگزیر حصہ ہیں اور آج بھی پوری دنیا میں ہمارے ملک کی شناخت ہیں۔ چوتھے باب "ہماری قوم" میں تہذیبی قدروں کے ساتھ سیاسی اتار چڑھاؤ کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان ابواب میں ہندوستان کی سرزمین اور تاریخی میراث پر اگرچہ اختصار سے مگر معتبر حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخری بات: ....اور ہم" اس کتاب کا اہم حصہ ہے کیونکہ اس میں پوچھا گیا ہے کہ ہم اپنے ہندوستان کو بدلے میں کیا دیتے ہیں جب کہ ہم اس سرزمین سے بہت کچھ پاتے ہیں! اور ویسے بھی ہمارے اقتصادی وسائل اور شاندار تمدنی ورثہ کسی ایک خطے کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ سارے ملک کی مجموعی ملکیت ہیں۔ بلا تخصیص مذہب و عقیدہ ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے کیونکہ ہماری ہندوستانی جمہوریت ان وطن پرستوں کی دین ہے جنھوں نے ہمارے سماج میں ایک قومیت کی عمارت تعمیر کی ہے۔ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے یہ ایک اہم کتاب ہے جو قارئین کو یقیناً پسند آئے گی۔

سحر سے پہلے/حنیف کیفی
صفحات: 256، قیمت: -/160 روپے
ناشر: مصنف، A-47، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی۔110025
مبصر: صغرا مہدی

"سحر سے پہلے" حنیف کیفی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ "چراغ نیم شب" 1986 میں شائع ہوا تھا۔ کیفی صاحب کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب سے گہری واقفیت ہے اور ان دونوں زبانوں کے استاد رہے ہیں۔ ان کی کئی اہم تنقیدی اور تحقیقی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں "اردو شاعری میں سانٹ" اور "اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم" بہت اہم ہیں۔

کیفی صاحب تنقیدی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہے، مگر ان کے اندر کا شاعر ان کو شعر کہنے پر اکساتا رہا اور وہ جو دل پر گزرتی رہی اسے شعروں کی صورت میں رقم کرتے رہے۔ کتاب کا انتساب دیکھیے: ''قریب و دور کے ان تمام رشتوں کے نام جن کے بخشے ہوئے زخموں کی جلن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رکھے گی۔''

کیفی صاحب کی شاعری ان کی زندگی کے تجربات کی عکاسی کرتی ہے۔ ''سحر سے پہلے'' بہت معنی خیز عنوان ہے۔ عمر کے جس دور سے وہ گزر رہے ہیں اور ہم بھی، سبھی ان احساسات سے دو چار ہیں مگر ان کو شعری پیکر عطا کرنا سب کے بس کی بات کہاں ہے! ''سحر سے پہلے'' کا شاعر بھی شامِ زندگی کی سحر ہونے کا منتظر ہے۔

کچھ رات جو باقی ہے سفر سے پہلے
گزرے نہ کہیں عرضِ ہنر سے پہلے
یہ تھوڑی سی مہلت ہے غنیمت کیفی
کہہ ڈالو جو کہنا ہے سحر سے پہلے

کیفی صاحب کو زندگی میں جن مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے—لوگوں کی بے اعتنائی، بے وفائی، بے رخی—ان کی حساس طبیعت نے ان کو شدت سے محسوس کیا ہے اور اسی شدت سے ان پر ردِ عمل ظاہر کیا ہے، :

اپنائیت کی آگ میں تنہا جلا ہوں میں
رشتوں کی رسمیات نے سمجھا نہیں مجھے
سوہانِ روح شورشِ انفاس چھین لے
اللہ میری شدتِ احساس چھین لے

وہ اس پر بھی آمادہ ہیں:

ذرا میں بھی تو کچھ احباب کا ردِ عمل دیکھوں
کچھ اخبارات میں میرے گزرنے کی خبر دے دو

اسی ضمن میں ان کی ایک نظم ''سزائے بے گناہی'' بہت خوبصورت ہے، جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

قدم قدم پہ یہ محسوس ہو رہا ہے مجھے
کہ مر کے بھی میں دلوں میں جگہ نہ پاؤں گا

اسی طرح ان کی ایک اور نظم ''آخرِ شب'' بہت موثر ہے، جو انھوں نے شدید بیماری کے دوران اسپتال میں کہی ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جو بھی آخرِ شب کے مسافر محسوس کرتے ہیں۔ نظم کا اختتام یوں ہوتا ہے:

یہاں سکوت میں لرزاں ہیں موت کے سایے
اچٹتی نیند، اچانک یہ میری بیداری
خدا ہی جانے یہ کیا ہے
نئی سحر کی بشارت؟
پیامِ آخرِ شب!

نظم اپنا بھر پور تاثر چھوڑتی ہے۔ نظم ''انتباہ'' کا بھی یہی موضوع ہے۔ ''ایک آرزو'' بھی اسی موضوع پر ہے۔ آزاد نظم جو انھوں نے اپنے والد کی یاد میں لکھی ہے وہ ایک فرد کا مرثیہ نہیں، بلکہ ہماری نسل کے جذبات کی بہت اچھی عکاسی ہے۔ جو ان رشتوں سے بندھے ہوئے ہیں ان کو کھو کر بھی ان سے طاقت حاصل کرتے ہیں:

پیار رہتا ہے مرے ساتھ برابر ماں کا
سایہ سر پہ نہ سہی ہاتھ ہے سر پر ماں کا

''رثائی انداز کے سانٹ'' کے تحت جو سانٹ ہیں وہ انھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کی اچانک موت پر کہے ہیں۔ ان میں تو انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔

کیفی صاحب کی شاعری میں رومان، شگفتگی بالکل نہ ہو ایسا بھی نہیں۔ ''سہاگ رات''، ''بیوی سے رخصت'' اور غزلوں کے اشعار میں عشق و محبت کے مضامین مل جاتے ہیں۔ خاص طور پر ان کی وہ غزل جس کی ردیف ''آنکھیں'' ہے اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ یہ کسی کی ''مخصوص'' آنکھوں کا ذکر ہے۔

''سحر سے پہلے'' کا شاعر اپنی ذات کے حصار ہی میں گم نہیں ہے، وہ اس سے نکلتا ہے تو غمِ دوراں اس کی شاعری کا موضوع بن جاتا ہے۔ اس موضوع پر ان کی غزلوں میں اشعار کی کمی نہیں، اور نظمیں بھی ہیں۔

کیفی صاحب نے مشہور انگریزی شعرا کی نظموں کے بہت خوبصورت ترجمے بھی کیے ہیں۔ ''راہِ نیاز'' کے تحت جو حمد اور نعتیں ہیں ان میں عقیدت کے اظہار میں ایک والہانہ پن ہے—وہ والہانہ پن جس میں سر ہی نہیں دل بھی جھک جاتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''سحر سے پہلے'' میں طرزِ بیان کی سادگی ہے، روایت کا احترام ہے، فن اور زبان و بیان پر قدرت کا اظہار ہے۔ یہ ایک حساس اور دردمند شاعر کی شاعری ہے جس سے سرسری نہیں گزرا جا سکتا ہے، اسے ڈوب کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔

سازِ سلاسل (شعری مجموعہ)/مظفر عازم

صفحات: 166، قیمت: -/125 روپے

تقسیم کار: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 3108، گلی وکیل،

کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔110006

مبصر: عبیدالرحمٰن

مظفر عازم کا شمار ایسی شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے کئی زبانوں کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ کشمیر میں نثری ادب کے فروغ کے لیے عالمی ادبی شاہکاروں کے تراجم میں مظفر عازم کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ مظفر عازم نے اگر دوسری زبانوں کی شاہکار تخلیقات کے ترجمے کیے تو خود ان کی تخلیقات کے بھی ہندوستان کی کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ اس لحاظ سے بھی ان کی شخصیت انفرادیت کی حامل ہے۔

''سازِ سلاسل'' مظفر عازم کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے جو نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ موصوف گذشتہ کئی برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ اس سے قبل وہ سعودی عرب میں تھے۔ لیکن ان کا آبائی وطن کشمیر ہے اور انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ وہیں گزارا ہے اور وہاں گزارے ہوئے دنوں کی یادیں آج بھی ان کی ہمسفر ہیں۔

بہار خو ہے خزاں میں چنار سایہ مرا
سکوں نواز سہارا ہے زندگانی کا
نہ پوچھ کس کے لیے ہیں یہ لفظ متروکات
نشاطِ سیرِ چمن، جھیل ڈل کی رعنائی

ایک غزل میں اس جنت نشاں وادی کے گذشتہ دنوں کی کہانی یوں بیان ہوئی ہے۔

کہتے ہیں کہیں اک بستی تھی، وہاں چاند ستاروں کے گھر تھے
نیلی جھیلوں میں امرت تھا اور امرت میں نیلو فر تھے
سب سرو رواں سر دھنتے تھے ہر موج ہوا کی شوخی پر
سنبل کہ زلیخا کی زلفیں شمشاد کہ یوسف پیکر تھے

اس غزل کا شعر ایک حساس دل کو تڑپا دیتا ہے اور کسک بن کر اس کی رگ و پے میں اتر جاتا ہے۔ مظفر عازم اس جنت نشاں وادی کی تصویر کو دھندلا کر دینے والی سازشوں سے بھی باخبر ہیں اور ان کاوشوں کی پیدا کردہ خرابیوں سے بھی مگر ان کے دل میں امید کا چراغ روشن ہے۔

رات کی تیرہ نصیبی میں درخشندہ رہا
راکھ کے ڈھیر میں یہ شوخ شرارا کیا ہے

مجموعے کے آغاز میں مخمور سعیدی کا مضمون شامل ہے جس سے مظفر عازم کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے مگر شاعر کی باطنی دنیا تک رسائی اور اس کی شاعرانہ شخصیت کی صحیح شناخت کے لیے اس کے اشعار سے براہ راست رابطہ ضروری ہے جن میں تہہ در تہہ معنی و مفہوم کی ایک دنیا آباد ہے۔ اس دنیا سے گزرتے ہوئے قاری محسوس کرے گا کہ وہ شاعری کی ایک انتہائی خوبصورت اور بامعنی فضا کی سیر کر رہا ہے۔ شعری مجموعوں کی بھیڑ میں ایسے مجموعے بہت ہی کم دستیاب ہیں جو خود کو پڑھوا لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جنھیں جتنی بار پڑھا جائے شاعری کی پرتیں کھلتی چلی جائیں۔ ''سازِ سلاسل'' ایسا ہی ایک مجموعہ ہے جو قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔

کتاب کے آخر میں شاعر کی چند کشمیری نظموں کے منظوم تراجم شامل ہیں، ترجمہ چونکہ خود شاعر نے کیا ہے اس لیے اس پر ترجمے کا گمان نہیں گزرتا۔ ان کے علاوہ فارسی کی دو غزلیں بھی شامل ہیں جو اس زبان پر شاعر کی گرفت اور قدرتِ کلام کا پتہ دیتی ہیں۔

□□□

دیوانِ حسرت عظیم آبادی

مرتبہ: ڈاکٹر اسما سعیدی

حسرت عظیم آبادی اپنے دور کے اہم شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک انتخاب حسرت موہانی نے بھی شائع کیا تھا۔ یہ ان کا مکمل دیوان ہے جس پر فاضل مرتبہ نے اپنے مقدمے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

صفحات: 484، قیمت -/100 روپے

دکن میں اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

یہ کتاب دکنیات کے سلسلے میں ایک اہم مقام رکھتی ہے اور متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ کتاب کے بعض بیانات سے بعد کے محققین نے جو اختلاف کیا ہے پیش لفظ میں مصنف کی جانب سے اس کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔

صفحات: 945، قیمت -/202 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک -8، ونگ -7، آر. کے. پورم، نئی دہلی ۔110 066

مصنف: جے شری پلائی
مترجم: صفدر نقوی

بچوں کا گوشہ

''ہمارے رہنما'' سے ماخوذ
دوسری اور آخری قسط

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "ہمارے رہنما" جلد ہشتم سے جگدیش چندر بوس کے احوال و کوائف اور تحقیقی کارنامے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ان تمام قومی رہنماؤں کی حیات و خدمات سے واقف کرایا گیا ہے جنھوں نے ملک و قوم کی خدمات کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ "ہمارے رہنما" کی اس جلد میں بپن چندر پال، کستوربا گاندھی، وٹھل بھائی پٹیل، رفیع احمد قدوائی، ونوبا بھاوے، شیاما پرساد مکرجی اور ہومی جہانگیر بھابھا سے متعارف کرایا گیا ہے۔ 161صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/35روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

جگدیش چندر بوس

جاندار اور بے جان:

جگدیش چندر بوس نے کوہیرنگ ریسیورز پر اپنی تحقیق جاری رکھی۔ انھوں نے معلوم کیا کہ اگر دھاتوں سے لگاتار برقی لہریں گزاری جائیں تو ان میں کمزوری آ جاتی ہے یا دھات کی حساسیت کم ہو جاتی ہے۔ انھوں نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ یہ جانوروں کے عضلات کمزور ہونے سے مشابہ ہے۔

جانداروں اور بے جان چیزوں میں مختلف قسم کے دباؤ اور تناؤ ہونے کی وجہ سے جو ردعمل ہوتا ہے ان میں آپسی مشابہت ثابت کرنے کی غرض سے انھوں نے ایک انوکھا آلہ مصنوعی ریٹینا بنایا۔ ریٹینا یا پردہ چشم ہماری آنکھوں کا ایک حساس پردہ ہے جو روشنی کی لہروں سے متاثر ہوتا ہے۔ مصنوعی ریٹینا ایک غیر نامیاتی ماڈل ہے جو جاندار نسیجوں پر ہونے والے برقی ردعمل کی خصوصیات کو دکھا سکتا ہے۔ یہ آلہ گیلینا کا بنا ہوا تھا جو کہ سیسے کا ایک نوری موصل ہوتا ہے، جو برقی میگنیٹک لہروں کے لیے حساس ہوتا ہے۔ بوس نے گیلینا کو نلکیٹ کے سامنے ایک عام لینس رکھ دیا۔ ایک گیلو ینو میٹر کی مدد سے اس پر ہونے والی برقی رو کا اثر ناپا گیا اور پھر اس کا تعلق گیلینا سے قائم کر دیا گیا۔ اس سے گیلینا کو نلکیٹ کا تعلق برقی میگنیٹک لہروں سے قائم کر کے گیلو ینو میٹر کی سوئی کا جھکاؤ دیکھتے ہوئے ایک خط منحنی تیار کیا گیا۔ ردعمل میں تبدیلی گیلینا میں پیدا ہونے والی کمزوری کے باعث تھی۔ بوس نے جو خط منحنی بنایا تھا وہ بالکل ویسا ہی تھا جو ڈاکٹر ویلر نامی فزیالوجسٹ (ماہر عضویات) نے اس وقت حاصل کیا تھا جب اس نے ایک مینڈک کے پردۂ چشم پر یہی عمل دہرایا تھا۔

جگدیش چندر بوس نے جانداروں اور ٹن جیسی بے جان اشیا پر مختلف کیمیائی عوامل کے اثرات دکھا کر اپنے حاصل کردہ نتیجوں کو مزید تقویت پہنچائی۔ جس طرح ایک جاندار نسیج (ٹیشو) میں جو زہر کے اثر سے مر چکا ہو حساسیت باقی نہیں رہتی اسی طرح ٹن میں بھی برقی رو کے لیے حس ختم ہونے لگتی ہے۔ ان حقائق نے بوس کو قائل کر دیا کہ جانداروں اور بے جان دھاتوں کے درمیان حد فاصل بہت کمزور ہے۔ جہاں تک حیاتی مظاہرے کا تعلق ہے، بے جان اشیا اور جاندار مادوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جولائی 1900 میں جگدیش چندر بوس نے پیرس میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل کانگریس آف فزکس کے دوران اپنے تجربات اور نتائج سائنس دانوں کے سامنے پیش کیے۔ ایک لاسلکی (وائرلیس) کا بہت بڑا تاجر جس کا نام موئیر ہیڈ تھا حاضرین میں شامل تھا، اس نے خواہش ظاہر کی کہ مصنوعی ریٹینا کو لاسلکی

ٹیلی گرافی کے لیے تجارت کی خاطر پیٹنٹ کرالینا چاہیے۔ اگر بوس اس بات پر راضی ہو جاتے تو ان کی تمام معاشی مشکلات کا حل نکل آتا بہرطور، سائنس کے تجارتی استعمال کے خلاف ان کے سخت رویے نے اس درخواست کو منظور نہیں ہونے دیا۔

اتفاقاً اس کانگریس میں سوامی وویکانند بھی موجود تھے۔ وہ بوس کے سب سے بڑے مداح بن گئے اور انھیں ہندوستان کا مایہ ناز سپوت بتاتے ہوئے ان کی تعریف کی۔

10 مئی 1901 کو جگدیش چندر بوس نے رائل سوسائٹی میں اپنی تقریر کے دوران کہا۔" آج شام میں نے آپ کو دباؤ اور تناؤ کی تاریخ میں زندہ اور بے جان کا خود ان کا اپنا تیار کیا رکارڈ دکھا دیا ہے جو درحقیقت اس قدر مشابہ ہے کہ ایک دوسرے سے فرق کرنا مشکل ہے۔" انھوں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی۔ پہلی بار میں اس پیغام کا ایک مختصر حصہ اس وقت سمجھ پایا تھا، جس کا اعلان میرے پرکھوں نے گنگا کے کنارے 30 صدی پہلے کیا تھا۔ وہ جو اس کائنات کی تبدیل ہوتی ہوئی نیرنگیوں میں صرف ایک ہی کو دیکھتے ہیں، حق ان ہی کے پاس ہے۔ کسی دوسرے کے پاس نہیں، کسی دوسرے کے پاس نہیں۔"

جب تقریر ختم ہوگئی اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ کم ہوئی تو سر رابرٹ آسٹن جو ایک مشہور فزسسٹ اور دھاتوں کے ماہر تھے بولے۔" میں نے ساری زندگی دھاتوں کی خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے۔ میں یہ سوچ کر خوش ہوں کہ ان میں زندگی ہوتی ہے۔"

پھر بھی کچھ سائنس داں ایسے بھی تھے جنھوں نے بوس کے پرزور انداز فکر کو سمجھنے سے انکار کر دیا جس کے ذریعے بعض فزیوکیمیکل وجوہ کی بنیاد پر نامیاتی اور غیر نامیاتی اشیا کو ایک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انھوں نے اسے میٹا فزیکل (مافوق طبعیات) جیسی مشرقی دماغ کی کوئی خیالی تصویر تصور کیا۔

درحقیقت جب جگدیش چندر بوس نے کانگریس کے سکریٹری کو اپنے اس خیال سے آگاہ کیا کہ فزکس، فزیولاجی اور سائیکولوجی ایک ہی ہیں تو اس نے متنبہ کیا۔" ایک ہی ریلے میں سب کچھ سمجھانے کی کوشش نہ کرو کیونکہ لوگ اتنی زیادہ حیران کن باتیں ہضم نہیں کر پائیں گے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ اگر تم ان کا تعارف کراؤ گے تو وہ تمھیں خوابوں کی دنیا کا آدمی سمجھیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم صرف فزیکل پہلو ہی سمجھانے سے ابتدا کرو۔"

البتہ یورپ کے سائنس دانوں کو جگدیش چندر بوس کے جینئس یا غیر معمولی دماغ کا مالک ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انھیں ایک معروف یونیورسٹی نے پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی لیکن مادر وطن کی محبت اور اس کے لیے احساس ذمے داری نے انھیں جگمگاتے یورپ کی طرف مائل نہ ہونے دیا اور وہ اپنی تحقیق اور مطالعہ جاری رکھنے کی خاطر ہندوستان واپس آگئے۔

حیران کن نظریات:

بوس نے غیر نامیاتی اشیا اور جانوروں کے نسیجوں کے برقی ردعمل میں مماثلت دریافت کی۔ انھوں نے پودوں میں اس ردعمل کی کھوج کی۔ اس طرح وہ فزکس اور حیوانیات سے پلانٹ فزیولاجی کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے پودوں میں ایک ہی جیسا ردعمل پایا۔ انھوں نے کئی طرح کے بیرونی لمس کا استعمال کیا جن میں دونوں طرح کے لمس یعنی میکانکی جیسے رگڑ، دباؤ اور کیمیائی جیسے کوپر سلفیٹ (نیلا تھوتا) شامل تھے۔ ان کی مدد سے وہ دکھا سکے کہ پودوں کے نسیجوں پر لمسی ردعمل بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ جانوروں کے نسیجوں پر۔ تاہم بعد کی دریافتوں میں ان کا یہ مفروضہ کہ پودوں میں فلوئیم نسیج جانوروں کے اعصاب جیسے ہوتے ہیں، باطل قرار دیا گیا۔

فزیالوجی کے بعض ماہرین، جیسے ڈاکٹر والر اور برڈون سینڈرسن نے ان کے ان خیالات سے اختلاف کیا کہ فطرت کے تنوع (پھیر بدل) میں وحدانیت ہوتی ہے۔ ان کے تحت انداز فکر نے ایک فزیولاجسٹ کی مداخلت کو ان کی سلطنت میں جارحیت کے مصداق سمجھا۔ انھیں ڈر تھا کہ ان کی نئی دریافتیں فزیولاجسٹ کے پرانے اور پائیدار عقیدوں کو درہم برہم کر دیں گی۔ یہاں تک کہ انھوں نے رائل سوسائٹی کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ ان کے مقالے نہ چھاپے جائیں۔

جگدیش چندر بوس نے وقار اور سکون کے ساتھ اس مخالفت کو قبول کیا۔ انھوں نے ضرورت سے زیادہ محدود موضوع پر خصوصی مطالعے سے پیدا ہونے والے خطرات کی پیش بینی کی تھی اور نتیجہ اخذ کیا تھا۔" اس بنیادی حقیقت کے گم ہو جانے کا خطرہ تھا کہ سچائی اور سائنس ایک ہوتی ہے جس میں علم کی تمام شاخیں شامل ہیں۔"

وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ بڑی حد تک درست تھے۔ فزکس، فزیولاجی اور سائیکالوجی کے لیے ان کا جو نظریاتی انداز فکر تھا اس نے سائنس دانوں کو فطرت کے بارے میں ایک متفقہ تصور قائم کرنے پر آمادہ کیا جس نے بالآخر ایک جدید سائنس" سائی برنے ٹکس" کو جنم دیا۔

جگدیش چندر بوس نے ایک بہت نازک آلہ بنایا جسے کریسکوگراف، کہتے ہیں۔ یہ ایک برقی آلہ ہے جس کی مدد سے ایک پودے کی بڑھوتری کو ایک ہزار سے دس ہزار گنا تک بڑھا کر صحیح صحیح ناپا جا سکتا ہے۔ کریسکوگراف کی مدد سے ان کیفیات کا مطالعہ ممکن ہے جو پودے کی نشو ونما کی شرح کو

تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے جو زراعتی سائنس دانوں کے لیے مفید ہے۔ بوس نے ہرے پودوں میں فوٹو سنتھیسس کی صحیح صحیح شرح بھی معلوم کی اور اس امکان کی طرف اشارہ کیا کہ سورج کی توانائی، جو فوٹو سنتھیسس کے دوران پودے جذب کرتے ہیں، اس کا زیادہ بہتر استعمال ہو سکتا ہے۔

ایک نظریہ جو جے.سی. بوس نے پیش کیا وہ خلیوں کے فزیولاجیکل عمل یعنی رقیق مادوں کے اوپر کی طرف چڑھنے کے بارے میں تھا۔ سیپ کے اوپر چڑھنے کا مطلب ہے پودوں کی جڑوں کے ذریعے پانی کا جذب کرنا اور پھر مخصوص نالیوں کے ذریعے پودے کے تمام حصوں تک اسے منتقل کرنا۔ بوس کے مطابق سیپ کے اوپر چڑھنے کا عمل اس دباؤ یا پمپنگ سے متاثر ہوتا ہے جو دباؤ مخصوص نالیوں پر وہ خلیے ڈالتے ہیں جو ان کے نزدیک موجود ہوں یہ ''وائٹیل'' نظریہ بھی کہلاتا ہے۔ آج تک اس نظریے کی تائید میں براہ راست کوئی ثبوت نہیں ہے۔

جگدیش چندر بوس نے پودوں اور جانداروں کی اندرونی کارکردگی کو سمجھنے کے لیے کئی خود کار رکارڈرس ایجاد کیے جو انتہائی نازک اور صحیح صحیح ریڈنگ دینے والے تھے۔ ادب کے نوبل یافتہ ہنری برگ ساں نے کہا۔ ''بوس کی معرکۃ الآرا ایجادات نے گونگے پودوں کو ان کی پوشیدہ زندگی کے اظہار کے لیے انتہائی مستند گواہ بنا دیا۔ بالآخر فطرت کو اس بات کے لیے مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنے ان رازوں کو اگل دے جو حفاظت کے ساتھ پوشیدہ رکھے گئے تھے۔''

جگدیش چندر بوس کے بعض نظریات ترقی یافتہ طریقوں سے کی گئی تحقیقات کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکے تاہم ان کی بہت سی دریافتوں نے فطرت کے بارے میں غلط تصورات کو مٹا دیا اور مستقبل میں تحقیق کی بنیاد رکھی۔ بوس نے اپنے مطالعے کے لیے کئی پودوں کا استعمال کیا تھا جس میں مائی موسا، یا چھوئی موئی کا پودا بھی شامل تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے بوس کے کام کی تعریف میں مائی موسا پر ایک نظم لکھی اور اسے ان کے نام سے منسوب کر دیا۔

میری دوست! میری بھائی ''مائی موسا'' کو دیکھو
دیکھو آسمانوں نے اسے کیا دیا ہے
اور ہواؤں نے کیا اڑایا
اس کا دل کیا عجیب پیغام چھپائے ہوئے ہے۔
اس کے پتوں کی تہوں میں سے
تمھیں نکالنا ہوگا اور جاننا ہوگا
اور اس خاموشی کو توڑنا ہوگا
تم جانتے ہو میرے دوست کہ چھوٹاپن معمولی نہیں۔
چونکہ سچائی کا ایک ذرہ بھی دنیا کو جگمگا دیتا ہے۔
حیا سے میری مائی موسا کی آنکھیں بند ہیں۔
میں جانتا ہوں تم پڑھو گے
زندگی اور موت کے پیغامات،
سورج کے اور سایے کے اور طوفان کے۔

شدید قومی جذبے نے جے.سی. بوس کو عام روایت کے مطابق اپنے آلات کے نام یونانی اور لاطینی کے بجائے سنسکرت میں رکھنے پر اکسایا۔ لیکن انھیں اپنا خیال بدلنا پڑا کیونکہ انگریزی زبان میں ان الفاظ کا تلفظ کچھ سے کچھ ہو گیا۔

جگدیش چندر بوس کی خواہش تھی کہ ان کے ہم وطن توہمات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے سائنسی مزاج اور ایک تجزیاتی دماغ پیدا کریں کیونکہ بہت سوں کی ترقی کے لیے یہ ایک رکاوٹ تھی۔ مثال کے طور پر فرید پور میں ایک پام کا درخت تھا جو آندھی کے دوران زخمی ہو گیا تھا۔ مقامی لوگ اسے ''عبادت گزار پام'' کہتے تھے کیونکہ وہ شام کو جھک جاتا تھا۔ لوگوں کا اعتقاد تھا کہ یہ ایک عبادت کرنے والا درخت ہے جو شام کو مندر کی گھنٹی بجنے پر عبادت کے لیے اپنا سر جھکا لیتا ہے اور صبح کو پھر سیدھا ہو جاتا ہے۔ بوس نے لوگوں کو دکھایا کہ پیڑ کا یہ عمل درجۂ حرارت میں تبدیلی کی بنا پر تھا۔ پیڑ کی اوپری اور نچلی سطح پر درجۂ حرارت سے پیدا ہونے والی تبدیلی یکساں نہیں تھی۔ اس لیے درجہ حرارت کی تبدیلی نے صبح کے مقابلے شام میں جھکاؤ کو زیادہ کر دیا۔ پیڑ کی حرکت اس کی دونوں سطحوں پر غیر یکساں ردعمل کی بنا پر تھی۔

اسکولوں میں سائنس کیسے پڑھائی جانی چاہیے اس کے بارے میں جے.سی. بوس کے خیالات بہت جدید اور عملی تھے۔ انھوں نے کہا تھا۔ ''ایجادی اور تخلیقی قوتیں محض سائنس کے مشکل اور پیچیدہ نظریات پر کام کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں بلکہ فطرت سے ہم آہنگی اور مشاہدے کی شدید قوت ہی سائنس کی اہم ترین محرک ہے۔ لوگ جو اپنی ذہانت کے لیے جانے جاتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اسکول میں سخت امتحان سے بھی پار اتر گئے ہوں۔''

1828 کے دوران جب بمبئی میں جے.سی. بوس نے یوتھ لیگ کو مخاطب کیا تو زور دے کر کہا کہ جب انھیں کوئی کام سپرد کیا جائے تو انھیں یہ کہہ کر کہ میں کوشش کروں گا، اس سے فرار کے بہانے تلاش نہیں کرنے چاہئیں۔ انھوں نے نوجوانوں سے کہا کہ اپنی ناکامی کے لیے انھیں یونیورسٹیوں، حکومت اور ناموافق حالات کو الزام نہیں دینا چاہیے۔ اس کے برعکس انھیں درپیش حالات کو قبول کرنا چاہیے اور مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی تکمیل کے لیے کام

کرنا چاہیے۔ اس کے لیے شاید خود بوس سے زیادہ اچھی مثال نہیں ہے۔

جگدیش چندر بوس انگریزی اور بنگالی کی کئی کتابوں اور مقالوں کے مصنف ہیں جن میں سے چند کے نام ہیں۔ زندہ اور بے جان میں ردعمل، پودوں کے حسی نظام اور پودوں میں نشو و نما اور ٹرا یک حرکت اور تقابلی الیکٹرو فزیولاجی۔ ان کی بہت سی کتابوں کا یورپین زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی سائنسی مقالے بھی شائع کیے اور مزاح کی چاشنی کے ساتھ آسان اور غیر تکنیکی زبان استعمال کی۔

جگدیش چندر بوس نے کافی پہلے 1894 میں بچوں کے لیے پودوں کی زندگی کے بارے میں عام فہم زبان میں مضامین لکھے تاکہ انھیں پودوں سے دلچسپی پیدا ہو۔ وہ ان میں پودوں کی زندگی سے متعلق سائنسی سوجھ بوجھ پیدا کرنے کی امید رکھتے تھے۔

کائناتی وحدت:

شاعر رابندر ناتھ ٹیگور جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم میں بیداری پیدا کی اور بڑھاوا دیا، بھن نو ے دتا جو روحانیت اور قومیت کا نشان تھیں اور جے سی بوس خود، جنھوں نے ہندوستانی قومیت کو سائنس کے میدان میں شاندار طریقے سے پھلنے پھولنے میں مدد کی تھی، دوستی کے مضبوط بندھن میں بندھ گئے۔ یہ تینوں کائناتی وحدت کے متلاشی تھے جس کا اظہار ٹیگور کے شاعرانہ تخیل، بوس کے تنوع میں وحدت کے تصور اور نو ے دتا کی روحانیت کی کھوج میں نظر آتا ہے۔

شاعر ٹیگور اور جے سی بوس نے ضرورت کے وقت ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا اور دنیا کو بہتر سے بہتر دینے کے لیے ایک دوسرے سے ترغیب اور فیضان حاصل کیا۔ جب بوس کو بیرون ملک اپنے قیام کے دوران سخت معاشی دشواریاں پیش آئیں تو ٹیگور نے رقم کا انتظام کیا تاکہ وہ اپنی تحقیق مکمل کر لیں۔ نو ے دتا کی خواہش تھی کہ بوس ایک ادارہ قائم کریں جو ہندوستان کی عقل و دانش کو جلا بخشے تاہم اس سے پہلے کہ ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا، ان کا انتقال ہو گیا۔

بوس کا تحقیقی ادارہ:

بوس ایک حقیقی اور خالص علمی ذہن کے مالک تھے اس لیے ملک کے لیے وہ اپنی ذمے داری سے غافل نہ رہ سکے۔ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ ہندوستانی طلبہ کے پاس ذہانت دلچسپی اور سائنسی تحقیق کے لیے ذہنی فکر موجود ہے لیکن وہ وسائل اور سہولتوں سے محروم ہیں۔

30 نومبر 1917 کو بوس کا سب سے زیادہ پسندیدہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا جب ''بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' عالم وجود میں آیا۔ افتتاحی گیت کسی اور نے نہیں بلکہ ٹیگور نے لکھا اور لیکچر ہال کو مشہور مصور نندن لال کی پینٹنگ نے زینت بخشی۔ یہ جستجو اور دانشمندی کا نشان تھا جس میں تخیل کی پرواز شامل تھی۔

بوس نے انسٹی ٹیوٹ کی نگر کو سجانے کے لیے سوجھ بوجھ کے ساتھ بجلی کا کڑکا (وجر) اور آدھی املا کی (گوز بیری پھل) کا انتخاب کیا۔ یہ نشانات انتہائی قربانی اور خدمت کو پیش کرتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سنت و ادھی چی نے اپنی جان قربان کر دی تاکہ ان کی ہڈیاں بجلی کا کڑکا (وجر) بن کر برائی کے خاتمے کے لیے استعمال ہو سکیں۔ اسی طرح یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ اشوک نے اپنی تمام دنیاوی چیزیں تیاگ دیں جن میں آخری املا کا آدھا پھل بھی تھا۔

اپنے روح پرور افتتاحی خطبے میں جگدیش چندر بوس نے انسٹی ٹیوٹ کو مندر سے تعبیر کیا جہاں اسکالرس حق کی تلاش میں انتھک کوشش کریں گے۔ بوس نے زور دیا کہ ہندوستان کو اپنے وجود کی حفاظت کے لیے ایک ایسی قوم بن جانا چاہیے جو صنعتی اور تجارتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہو اور جہاں مغرب کی مانند تخریب کے لیے سائنس کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔ انھوں نے کہا۔'' تمام دریافتیں عوام کی ملکیت ہوں گی۔ کوئی شے پیٹنٹ نہیں ہوگی۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ کی سہولتیں تمام ممالک کے کام کرنے والوں کو فراہم کی جائیں۔ اسی طرح میری کوشش ہوگی کہ میرے ملک کی وہ روایات قائم رہیں جنھوں نے 25 صدی پہلے اپنی قدیم درسگاہوں نالندہ اور ٹکسلا میں دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے طالب علموں کو خوش آمدید کہا تھا۔''

اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ علم حقیقتاً بین الاقوامی ہے، جگدیش چندر بوس نے امید ظاہر کی کہ ہندوستان کا ذہین ترین دماغ جو انسٹی ٹیوٹ کے دروازوں سے نکلے گا وہ پھلے پھولے گا اور انسانیت کے مفاد میں اپنی خوشبوئیں بکھیرے گا۔

جگدیش چندر بوس نے جو کہا اس پر عمل کیا۔ انھوں نے برطانوی دانشوروں کے ایک مجمعے کے سامنے میگنیٹک کریسکو گراف کے بارے میں جو توضیح اور تشریح کی اس پر ٹائمس نے بیان دیا'' سائنس کے لیے ان کی کوششیں محض سائنس کے لیے نہیں ہیں بلکہ انسانوں کے لیے اس کے استعمال اور فوائد کے پیش نظر ہیں۔''

انسٹی ٹیوٹ کو عوام اور گورنمنٹ سے خاطر خواہ امداد ملی۔ گاندھی جی کی عوام سے اپیل کا ردعمل بہت فیاضانہ تھا۔ انسٹی ٹیوٹ نے پابندی کے ساتھ ''ٹرانزیکشن آف دی بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' نکالا جس نے انسٹی ٹیوٹ

میں ہونے والی نئی تحقیقات سے دنیا کو روشناس کیا۔

جگدیش چندر بوس پر قومی اور بین الاقوامی اعزازات کی بارش ہوئی۔ انھیں 1913 میں ملازمت سے سبکدوش ہونا تھا لیکن پریسی ڈینسی کالج نے انھیں خصوصی اعزاز دیتے ہوئے ان کی خدمات مزید دو سال کے لیے بڑھادیں اور وہ 1915 میں ریٹائر ہوئے۔ گورنمنٹ نے مزید پانچ برس کے لیے پوری تنخواہ پر انھیں بحیثیت ''امیریٹس پروفیسر'' نامزد کیا۔ 1917 میں جے.سی.بوس کو ''نائٹ ہوڈ'' (سر) کے خطاب سے نوازا گیا۔

13 مئی 1920 کو جے.سی.بوس رائل سوسائٹی کے فیلو شپ منتخب ہوئے وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھیں سائنس کے میدان میں یہ مرتبہ حاصل ہوا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی نے انھیں'' کیپے ٹین آف اسٹار آف انڈیا'' اور'' کم پے نین آف دی انڈین ایمپائر'' کے خطابات دیے۔ بہت سے ممالک اور شہروں جیسے جرمنی، مصر، ویانہ، برلن نے انھیں اپنی یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ مشہور و معروف سائنس دانوں نے ان کے اعزاز میں استقبالیے دیے۔ وہ چھ مہینے سے زیادہ سائنٹفک ڈیپوٹیشن پر یوروپ بھیجے گئے۔ 1926 میں بوس کو لیگ آف نیشنز کی'' کمیٹی آن ان ٹیلیکچوئل کوآپریشن'' کا ممبر نامزد کیا گیا جس کی سالانہ میٹنگ جنیوا میں ہوتی تھی۔

جگدیش چندر بوس کے ساتھی ذہین ترین افراد جیسے نوبل انعام یافتہ البرٹ آئینسٹائن اور مشہور برٹش اسکالر جارج گلبرٹ تھے۔ بوس نے اپنی کامیابی کو کبھی ذاتی نہیں کہا بلکہ اسے اپنے ملک ہندوستان کی کامیابی قرار دیا۔

جگدیش چندر بوس کو ان کی ستر سالہ یوم پیدائش پر معروف شخصیات جیسے رچرڈ گری گوری، جو نیچر میگزین کے ایڈیٹر تھے، جارج برنارڈ شاہ پروفیسر ہنس مولیش جانے مانے پلانٹ فزیولاجسٹ تھے اور روماں رولاں نے انھیں مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر مولیش بوس کے کام کے بڑے مداح تھے۔ انھوں نے بوس کی کتاب پلانٹ آٹوگرافس اینڈ دیئر ریویلیشین کے جرمن ترجمے کا پیش لفظ لکھا۔ وہ بوس انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت مہمان پروفیسر تشریف لائے۔

جے.سی.بوس کے سائنسی کام میں جو ایک فلسفیانہ اندازِ فکر شامل تھا اسے صرف سائنس دانوں ہی نے نہیں بلکہ تمام حساس دماغوں نے پسند کیا۔

پیکر:

جگدیش چندر بوس ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے جس نے ان کی صحت کو متاثر کیا۔ 23 نومبر 1937 کو جب یہ عظیم سائنسداں تقریباً 79 برس کے تھے ان کا انتقال ہو گیا۔

بہن نوے دتا نے ایک خط میں ٹیگور کو لکھا۔'' میں یہ جان کر پریشان تھی کہ ایک بڑے کارکن کو لگاتار معمولی چیزوں کی دقتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ کالج کے روزمرہ کاموں کو ہر ممکن حد تک ان کے لیے دشوار بنا دیا گیا تھا تاکہ انھیں تحقیقی کاموں کے لیے وقت نہ مل سکے۔ پھر بھی یہ بات کتنی حیران کن ہے کہ ہمارے دوست نے اپنا کام جاری رکھا اور باوجود وقتی دشواریوں کے جو انھیں گھیرے تھیں، کار ہائے نمایاں انجام دیے۔''

جگدیش چندر بوس نے اس لازمی ہم آہنگی کو جو مشرقی دانشوری کی روح اور مغربی سائنس کے درمیان ہے اخذ کر کے دوسروں تک پہنچایا۔ وہ سائنس کو بلند کر کے روحانی حقیقت کے دائرے تک لے گئے۔ زندگی کا کائناتی تصور در حقیقت ان کا ایک باہمت خیال تھا۔

جواہر لال نہرو کی طرح جگدیش چندر بوس بھی خیال کرتے تھے کہ ہندوستانیوں کو سائنسی اور تجزیاتی دماغوں کو فروغ دینا چاہیے جو سوسائٹی کو بہتر بنا سکیں، بھلائی اور ترقی کو یقینی بنائیں اور مجموعی طور پر دنیا پر اثر انداز ہوں۔ بوس کو زبردست سائنسی کارنامے انجام دینے کے سلسلے میں ہندوستانی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ہمیں سخت محنت کر کے ہندوستان کو علم کا مرکز اور ایک اعلیٰ قوم بنا لینا چاہیے۔

ہمارا ملک صدیوں سے علم و دانش کا گہوارہ رہا ہے۔ جگدیش چندر بوس کے کام نے ہمیں ہماری وہ کوتاہیاں یاد دلائیں جو تلاش علم میں ہم سے ہوئی ہیں۔ ہم نے برسوں جہالت کے توہمات اور خوف کو پنپنے دیا جو ہمارے دل و دماغ پر غالب آ گیا اور نتیجے میں ہمیں بدقسمتی اور افلاس ملا۔

جگدیش چندر بوس نے بوس انسٹی ٹیوٹ کی افتتاحی تقریر میں کہا تھا۔'' اس طرح فزیولاجی اور نفسیات کے راستے قریب آتے ہیں اور مل جاتے ہیں اور یہاں ہم ان لوگوں کو جمع کرتے ہیں جو نیرنگیوں میں یک رنگی دیکھیں گے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ہندوستان کا جینیس (اعلیٰ طرز فکر یا تصور) صحیح معنوں میں پھل پھول سکے گا۔''

جگدیش چندر بوس نے ہندوستان کو مضبوطی کے ساتھ جدید سائنسی تحقیق کے راستے پر ڈال دیا۔

□□□

لکشمی راج شرما
ترجمہ: محمد سلیم

انگریزی کہانی

چھوٹی امّی

اسلم نو ہی سال میں انیس کا ہو گیا تھا۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ اس کے والد اور اس کی ماں سے ملنے سلطان پور بہت کم آتے۔ لکھنؤ میں کاروباری مصروفیت ایسی تھی کہ زاہد کو اپنے بال بچے سے ملنے کی فرصت نہ ملتی۔ اور پھر زبیدہ بیگم اس کے جوڑ کی نہ تھیں۔ وہ خوب رو اور شہری تہذیب سے آراستہ جب کہ بیگم ایک دیہاتی عورت۔ تاہم زاہد اپنے بال بچے سے یکسر غافل نہ رہتے۔ جب بھی وہ سلطان پور آتے تو اپنے ساتھ ڈھیر سارے کھلونے اور سامان لاتے۔ زبیدہ کی ہر خواہش پوری ہوتی، سوائے ایک کے — ان کا ساتھ! اور یہی زبیدہ کی آرزوئے انتہا تھی۔ لیکن انھوں نے کبھی لب کشائی نہ کی۔ دونوں کے معیار میں بڑا فرق تھا۔ شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بیوی گنوار دیہاتی۔ زاہد خاں اس کے لیے جو بھی کر دیتے وہ تعریف ہی کرتی، اور کر بھی کیا سکتی تھی!

البتہ اسلم کی نگاہ میں اس کی ماں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کو وہ خوب صورت بھی لگتی تھیں۔ شاید ان کی خوبصورتی ان کی سادگی اور خوش اخلاقی میں مضمر تھی۔ اسلم اپنے والد کے بارے میں ذرا الگ سوچتا تھا اور وہ بجھا بجھا سا رہتا۔ جب زاہد کپڑے کھلونے اور مٹھائیاں وغیرہ لاتے تب بھی اس کو کوئی خوشی نہ ہوتی اور وہ گرم جوشی کا مظاہرہ بالکل نہ کرتا۔ یہاں تک کہ باپ کی آغوش میں بھی غمزدہ ہی رہتا، اس کے پاس شفقت پدری کا ایک ہی جواب تھا، نمائشی اور مصنوعی مسکراہٹ۔ زاہد کو بھی اپنے لڑکے سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ اس کی سانولی رنگت ان کی خلش کا سبب تھا۔ دراصل اسلم اپنی ماں کو پڑا تھا جب کہ زاہد اسے اپنی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔ زبیدہ کی بدصورتی زیادہ پریشانی کی باعث نہ تھی کیونکہ وہ حجاب میں رہتی تھی۔ لیکن لڑکے کو تو دنیا کے سامنے پیش ہونا تھا۔ بیٹے سے محبت تو ایک فطری بات ہے لیکن زاہد کبھی ظاہر نہ ہونے دیتے بلکہ گوشۂ تاریک میں ہی رکھتے۔ دراصل باپ اور بیٹے کے درمیان یہ ایک سرد جنگ تھی اور معاملے کا افسوس ترین پہلو یہ تھا کہ زاہد خان بیٹے کے اندرونی بغاوت سے بالکل پریشان نہ تھے۔ وہ چھوٹے سے نازک دل میں اٹھتے ہوئے طوفان سے بالکل لاپرواہ ہو چکے تھے۔

اس دن شام کو جب زاہد خاں اپنی چمچماتی نویوٹا میں سلطان پور سے لکھنؤ روانہ ہوئے تو زبیدہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کے لیے بلایا۔

''اسلم''

''جی امی؟''

''میں دیکھتی ہوں کہ تم اپنے ابا کا خیال نہیں رکھتے۔''

''جی امی''

''بیٹا وہ تمھارے ابا ہیں اور تمھیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔''

''جب وہ جا رہے تھے تو میں نے سلام کیا تھا، امی۔''

''لیکن دل سے نہیں بس خانہ پوری کر دی جب میں اپنے ابا کو سلام کرتی تھی تو آواز دل سے آتی تھی۔''

''کیا آپ کے ابا آپ کے ساتھ رہتے تھے؟ آپ کا خیال رکھتے تھے، امی؟''

''ہاں! اور تمھارے ابا بھی تو تم سے محبت کرتے ہیں۔''

''امی، آپ یہ بات دل سے کہہ رہی ہیں؟''

زبیدہ اسلم کو قائل نہ کر سکی۔ جس چیز کے بارے میں آپ خود مطمئن نہ ہوں دوسرے کو سمجھانا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے اور زبیدہ تو اس صلاحیت سے محروم ہی تھی۔

زبیدہ اور اسلم کی شادی ہوئے دس برس ہو گئے تھے لیکن ایک ہی بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ اسلم، زبیدہ کو اس کا غم بھی تھا۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو رہی تھی۔ کیا وہ اتنی بدصورت ہے کہ میاں کے قابل بھی نہیں؟ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ان کا رویہ بھی بدلے! اس نے کبھی لکھنؤ جانے کے لیے نہ کہا تھا۔ درحقیقت وہ اس شک میں مبتلا تھی کہ زاہد وہاں کسی اور کے محبت میں گرفتار ہے۔ اس نے سوچا کہ شک شک ہی رہے تو بہتر ہے کیونکہ اگر خدانخواستہ اس کا شک صحیح نکلا تب کیا ہوگا؟ زاہد نے کسی سے شادی کر لی تو کیا کرے گی؟ اسلم کا کیا ہوگا؟ انھی خیالات سے ہر وقت دوچار رہتی۔ صرف ایک بات تھی جس سے کچھ سکون ملتا کہ کم از کم اسلم کو بڑا لڑکا ہونے کا فائدہ ضرور ملے گا۔

اکثر زبیدہ خواب میں اپنے میاں کو نئی دلہن کے ساتھ دیکھتی اور پریشانی کے عالم میں اس کی نیند ٹوٹ جاتی۔ کبھی اس سے بھی بدصورت زرق برق کپڑوں میں ملبوس زاہد کے بغل میں بیٹھی دکھائی دیتی اور کبھی ایسا ہوتا کہ وہ شوہر کی طرح تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند عورت نظر آتی، واقعی ان کے جوڑ کی۔ لاکھ بھولنے کی کوشش کرتی لیکن اس کے خواب اسے پریشان کرتے رہے۔ جب تک خواب خواب ہی رہا تب تک تو چنداں پریشانی کی بات نہ تھی لیکن آخر کار وہ دن آہی گیا جب یہ خواب حقیقت میں تبدیل ہو گیا۔ ڈاکیہ زبیدہ کے لیے ایک خط لایا جس نے بچی کچھی امیدیں بھی ختم کر دیں۔

'' پیاری زبیدہ

تمھیں یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ لکھنؤ کے اعلیٰ معاشرے میں تعلیم یافتہ بیوی کے بغیر آنا جانا مشکل ہو گیا تھا۔

میرے فیصلے سے تم کو تکلیف تو ہوگی لیکن تم نے اکیلے جینا سیکھ لیا ہے۔ اور تم نے ہمیشہ سمجھداری سے کام لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان حالات کو محسوس کرنے کی کوشش کرو گی جن سے مجبور ہو کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے ایک اور لڑکا چاہیے اور ایسا لگتا ہے کہ تم نے ایک سے آگے نہ بڑھنے کا تہیہ کر رکھا ہے میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد میرا کاروبار لڑکھڑا جائے۔ اسلم میاں مجھ سے دور بھاگتے ہیں اور میرے کام میں ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ ان کے والد کی کیسٹ کمپنی کا شمار ملک کی سب سے بڑی کمپنیوں میں ہوتا ہے میں ان سے ناامید ہو گیا ہوں۔

اب جو تمھاری بہن ہونے والی ہیں وہ کوئی اور نہیں بلکہ مشہور گلوکارہ فیروزہ خاتون ہیں۔ پورے لکھنؤ کو میری قسمت پر رشک ہے۔ جب تم دیکھو گی کہ وہ اپنی آواز ہی کی طرح خوب صورت بھی ہیں تو تم کو میرے اس فیصلے سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ ان کا ہمارے گھر میں آنا ہر اعتبار سے باعث افتخار ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ آپ اور اسلم شادی میں ضرور شریک ہوں گے۔ آپ کی غیر موجودگی کا غلط مطلب لگایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اسلم اپنی چھوٹی امی سے مانوس بھی ہو جائے گا۔ آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میں آپ سے قطع تعلق نہیں ہو رہا ہوں۔

ہمیشہ کی طرح آپ کا
زاہد خان''

زبیدہ پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ خط ہاتھ میں لیے گھنٹوں بے حس و حرکت بیٹھی رہی، خیالوں میں گم۔ ''امی، کیا ہوا؟'' اسلم نے پوچھا۔

زبیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بے سدھ بیٹھی رہی مستقبل کی تاریکی میں کھوئی ہوئی۔ اسلم کا سوال خلا میں ہی کہیں کھو گیا۔

کیا ہوا، امی؟ اسلم نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا اور اس کے ہاتھ سے خط چھین کر پڑھنے لگا۔ اس کے رخسار بھیگ گئے۔ اس نے ایک دو گھروں کو دیکھا تھا جن میں دو بیویاں تھیں لیکن خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایک دن اس کا گھر بھی ایسا ہوگا۔ غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ماں سے بے پناہ محبت اور جذبات کے طوفان میں وہ ہوش کھو بیٹھا۔ خود پر قابو نہ رکھ پایا، بے ساختہ ماں سے لپٹ گیا اور وہ رونے لگی۔ ماں بیٹے کی ایک ہی کیفیت تھی دونوں ایک ہی احساس کے بوجھ سے دبے پڑے تھے۔

اچانک جیسے ماں کی خوشیوں کی ساری ذمہ داری اسلم کے کمزور کاندھوں پر آپڑی تھی ''ہم شادی میں شریک نہ ہوں گے'' اسلم نے فیصلہ سنایا۔ زبیدہ خاموش رہی۔ ''اب تم سمجھی کہ میں ابا کی عزت کیوں نہیں کرتا؟'' اسلم نے خط ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

سناٹا طاری رہا۔ مکمل خاموشی پھر جھینگروں نے وائلن کی دھن چھیڑی۔ اسلم نے زور سے ایک طمانچہ رسید کیا کچھ دیر بعد ماں سے پھر لپٹ گیا اور نیند اس کے جذبات پر غالب آگئی۔ صبح جب وہ بیدار ہوا تو دیکھا کہ ماں سوئی ہی نہ تھی۔ بے سدھ پڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ اسلم نے بار بار اس کو جھنجھوڑا۔ آخر وہ گویا ہوئی۔

'' بیٹا، تمھیں اپنے ابا سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ انھیں کوئی پڑھی لکھی اور خوب صورت عورت چاہیے تھی میرے اندر یہ باتیں نہیں ہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے افسوس نہیں ہے۔ آخر وہ چیز مل گئی جس کے لیے وہ اتنے دنوں سے بے چین تھے۔ میں تو ان پر تھوپ دی گئی تھی۔ تمھیں شادی میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔ تمھارے نہ جانے سے ابا تم سے اور دور ہو جائیں گے۔ میں نہ جاؤں گی کیونکہ میں زیادہ دیر تک ان کی خوشی کا ساتھ نہیں دے سکتی، لیکن تمھیں میری قسم، اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو تم ضرور شریک ہوگے۔'' اسلم خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اس فیروزہ خاتون سے ملنا چاہتا تھا کہ موقع ملے تو اس کے کھانے میں زہر ملا دے۔

''اگر تم اپنے ابا کا دل جیت لو تو مجھے واقعی خوشی ہوگی۔ تمھیں ان کے

ساتھ لکھنؤ میں رہ کر کسی اچھے اسکول میں پڑھنا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی چھوٹی امی کے بچوں سے کسی طرح پیچھے نہ رہو۔" اسلم خاموش رہا لیکن اسے احساس ہوا کہ ماں کی بات مناسب ہے۔

اسلم نے اتنی شاندار شادی کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ غم کا مارا خاموش ایک کنارے بیٹھا رہا۔ تقریبات سے دور، الگ تھلگ، بجھا بجھا۔ وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی وہ شادی میں شریک نہ تھا۔ کھانا حلق سے اتارنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کھانا مہمانوں کی تعداد کے تناسب سے بہت زیادہ بنایا گیا تھا۔ اسلم کو ایسا لگ رہا تھا جیسے گدھیں مردار جانور کھا رہی ہوں۔

خاموش اور گم صم اسلم نہایت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ باپ کے فیصلے اور ماں کی زندگی میں آئے زلزلے نے اسے اچانک تجربہ کار بنا دیا تھا۔ پھر وہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگا اس نے دیکھا کہ لوگ عمدہ لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں جب کہ اس کے کپڑے ادنیٰ درجے کے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ تقریب میں شامل ہونے کے لائق نہیں ہے۔ اس نے سوچا کہ لکھنؤ کے درزی اس کے اپنے شہر کے درزیوں سے کس قدر بہتر ہیں۔ جو مہمان شریک خانہ آبادی تھے وہ نہ صرف زرق برق کپڑوں میں ملبوس تھے بلکہ انداز گفتگو، تہذیب و سلیقہ غرض یہ کہ ہر اعتبار سے اعلیٰ و برتر تھے۔ اسلم نے سوچا کہ کچھ لوگ اسے طنزیہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ تو دنیا ہے اور اس دنیا میں اسلم کو اپنا وجود سنوارنا تھا اور وقت کے تیوروں کا سامنا کرنا تھا۔ سلطان پور میں اسلم کی پرورش اس طرح ہوئی تھی کہ وہ اس ماحول سے ہم آہنگ نہ ہو پا رہا تھا۔ وہ ان چیزوں سے محروم تھا جو ایک کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

زاہد خان اس دن شام کو بہت خوش تھے انھوں نے اسلم کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اسلم بھی اپنے والد سے ملنے کا بہت خواہش مند نہ تھا۔ لیکن دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ زاہد کی پھیکی مسکراہٹ کے جواب میں اسلم نے بھی مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ شادی کی دھوم دھام ختم ہوئی۔ جس کمرے میں اسلم لیٹا ہوا تھا اس کے بغل والے کمرے میں اس کے والد تھے...... اپنی نئی دلہن کے ساتھ۔ اسلم جاگتا رہا اسے ماں کی یاد آ رہی تھی وہ ہمیشہ اس کے ساتھ سوتی تھی۔ ماں کے بنا بھلا نیند کب آتی۔ وہ ماں کے بارے میں سوچتا رہا۔ بیچاری کی کیا حالت ہوگی؟ اور پریشانی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے خیال ہی نہ آیا کہ اس کے آنسو دھیرے دھیرے سسکیوں میں بدل گئے ہیں۔ اس نے روکنے کی کوشش کی لیکن رونے کی آواز تیز ہوتی گئی۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ دلہا دلہن کو بستر پر گئے دو گھنٹے ہو چکے ہوں گے۔ درمیانی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے سوچا کہ تسلی دینے آ رہے ہیں۔ آنسو جاری تھے، سسکیاں رکتی نہ تھیں لیکن اس نے اپنا جسم سخت کر لیا۔ چند لمحے انتظار کیا لیکن کسی کے بولنے کی آواز نہ آئی۔ کچھ دیر بعد اسلم نے ہلکی سی آنکھ کھولی۔ کمرے میں تھوڑی سی روشنی آ رہی تھی، وہاں اس کے والد نہیں بلکہ دلہن تھی۔ اسلم جاگتے ہوئے بھی سوتا رہا اور اپنے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ دلہن قریب آئی اور کمرہ روشن کر دیا کچھ دیر تک کسی طرف سے کوئی حرکت نہ ہوئی پھر اسلم نے آنکھیں کھولیں وہ اب بھی رو رہا تھا۔ پہلی بار اس نے دلہن کو قاعدے سے دیکھا کیوں کہ ابھی تک یا تو مردوں کے بیچ تھا یا اس کمرے میں قید کر دیا گیا تھا۔ چڑیل کتنی حسین ہے! ان کی حسن و خوبصورتی پر وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھول ہی گیا کہ یہی وہ عورت ہے جس نے اس کی ماں کی خوشیاں چھین لی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے دیکھتے رہے، بنا ہم کلام ہوئے۔ اسلم نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور بھلا کیا کرتا؟ فیروزہ خاتون کی موجودگی اسے اپنی بدصورتی کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ بھدے بطخ کی طرح جب کہ فیروزہ ایک خوب صورت ہنس کی مانند۔ اس کا ان سے کیا واسطہ، آخر وہ یہاں کیا کر رہی ہیں!

وہ قریب آئیں اور اس کے بغل میں بیٹھ گئیں۔ لڑکے کو مشفقانہ نظروں سے دیکھا اور چمٹا لیا۔ جب اس کی سسکیاں بند ہو گئیں تو وہ التجا کرنے کے انداز میں مسکرائیں۔ ان کی دل کش و پرکشش زیر لب تبسم سے وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔

"تم کتنے پیارے بچے ہو!" انھوں نے اپنی مترنم آواز کا جادو بکھیرا۔

اسلم نے اپنا چہرہ چھپا لیا اس نے سوچا کہ ان کے بغل میں اس کا رنگ کوئلے کی مانند لگ رہا ہوگا۔ وہ اسے دیکھتی رہیں، مسکرائیں پھر ہنس پڑیں اور کہا۔

"تمھیں مجھ سے نفرت ہے، نا"؟

اسلم خاموش رہا۔ انھوں نے اسلم کو اپنے سامنے بٹھایا اور کہا "تمھیں مجھ سے نفرت ہے تو رہے۔ لیکن آج رات تم ہمارے ساتھ سوؤ گے۔"

اسلم دونوں کے بیچ لیٹا تھا۔ اسے عجیب لگ رہا تھا۔

زاہد خان کو اسلم کا مخل ہونا بالکل اچھا نہ لگا لیکن فیروزہ خاتون اپنی سی کر کے رہیں۔ وہ بچے کو رات بھر سینے سے چمٹائے رہیں۔ اپنی چھوٹی امی کے اس برتاؤ پر اسلم کے حیرت کی انتہا نہ رہی۔ آخر یہ عورت چاہتی کیا ہے؟ کسی اجنبی عورت کی تو بات دیگر ہے، اسلم کبھی اپنے والد کی بغل میں بھی نہ سویا تھا۔

اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ چھوٹی امی کا مشفقانہ برتاؤ، ایسا حسن سلوک اور محبت، اس نے سوچا بھی نہ تھا۔'' آخر میں ایسی نیک دل خاتون سے بدظن کیسے ہوسکتا ہوں؟'' اس نے سوچا۔ ان خوش گوار لمحات نے بچے میں انقلاب برپا کردیا گویا اس کو اپنے وجود کا احساس ہوگیا ہو۔ بے معنی زندگی کے گڈھے سے نکل کر اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ اسے اب تعلیم یافتہ معاشرے کا حصہ بننا تھا۔ کیا اب بھی بغاوت کی کوئی گنجائش تھی! رات جو کچھ پیش آیا، ایک پہیلی تھی...... اس کی سمجھ سے باہر، لیکن افق صاف تھا اور وہ نئی روشنی سے ہمکنار ہوچکا تھا۔

دن بہ دن اسلم چھوٹی امی سے قریب ہوتا گیا۔ فیروزہ خاتون مداحوں سے گھری رہتی تھیں۔ ان کی کرشمائی شخصیت سے وہ بہت متاثر تھا۔ کوئی بھی ان کی بات نہ ٹالتا تھا لیکن ان سب کے باوجود وہ ہمیشہ اسلم کے لیے فکرمند رہتیں۔ وہ اسلم اور اس کے ابا کا دل جیتنے کا تہیہ کرچکی تھیں۔ گھر کی ضرورتیں کبھی نظر انداز نہ کرتیں۔ اسلم کو اپنی چھوٹی امی سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ طور طریقہ، اخلاق و عادات، شائستہ و شگفتہ گفتگو، دوسروں کو موہ لینے کا فن۔ سلطان پور کا نقش اس کے ذہن سے مٹتا گیا۔ سلطان پور اس کا اپنا شہر ویسے تو ٹھیک ہی تھا۔ لیکن اب کتنا پھیکا کتنا بے رنگ معلوم ہوتا تھا۔ وہاں کے ماحول میں وہ ترقی کے منازل طے نہیں کرسکتا تھا۔ وہاں آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کا تصور ہی نہیں تھا۔ دراصل سلطان پور میں وسائل محدود تھے۔ لکھنؤ کے مقابلے میں وہاں نفاست اور سلیقے کی کتنی کمی تھی! اسلم نے محسوس کیا کہ نفاست و نزاکت، شائستگی و سلیقہ کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ اس کی چھوٹی امی سراپا مہذب تھیں۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ نفرت و بغاوت کا جذبہ بھولنا ہوگا۔ سلطان پور میں جو باغیانہ روش تھی اسے درکنار کرنا ہوگا۔ آخر اسے اپنی زندگی کے بارے میں سوچنا تھا۔ اپنے اندر کے مرد کو بیدار کرنا تھا۔

پہلی بار جب اسلم نے اپنی چھوٹی امی کو گاتے ہوئے دیکھا تو ان کی آواز کا دیوانہ ہوگیا۔ وہ اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ صرف شکل وصورت اور آواز کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ انھوں نے ہی یہ احساس کرایا تھا کہ وہ کسی چیز میں کم نہیں ہے۔ شکل وصورت، طور طریقہ، سلیقہ وقرینہ کسی چیز میں نہیں۔ انھی کی وجہ سے اس نے یہ خود اعتمادی پائی تھی کہ میں بھی ایک کامیاب آدمی بن سکتا ہوں۔ کیا سلطان پور اور سگی ماں کی محبت سے یہ سب ممکن ہوسکتا تھا؟

□□□

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی اقبال کی حیات اور شاعری کی چھان پھٹک کے لیے وقف کررکھی تھی، اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/11 روپے

جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر وادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر وادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک وتہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے'' جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن'' میں شاعر کی زندگی اور فن کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی وعلمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت: -/38 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

قومی اردو کونسل نے اردو زبان اور رسم الخط سکھانے کے لیے پورے ملک میں 146 اردو اسٹڈی سینٹر قائم کیے ہیں جن میں ہر طبقے، مذہب اور عمر کے لوگوں نے داخلہ لیا ہے۔ ان اسٹڈی سینٹروں میں کنٹیکٹ کلاس کی سہولت بھی دستیاب ہے۔ تصویر میں سینچری پبلک اسکول، مالیرکوٹلہ (پنجاب) کے اردو ڈپلوما کورس کی کنٹیکٹ کلاس میں اردو رسم الخط کی باریکیاں سمجھاتے ہوئے پروفیسر انصاری ایم شفیق۔

سہ ماہی "سائنس کی دنیا" کے سابق ایڈیٹر محمد خلیل کو گذشتہ دنوں سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبۂ سائنس ٹیکنالوجی کمیونیکیشن کونسل، حکومتِ ہند نے بچوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو مقبول بنانے کے لیے ان کی نمایاں کوششوں کے اعتراف میں قومی ایوارڈ پیش کیا ہے۔ اس موقعے پر لی گئی یادگار تصویر میں (بائیں سے) پروفیسر رام مورتی، سکریٹری شعبۂ سائنس ٹیکنالوجی، پروفیسر گوریکر اور جناب کرن کارنک (صدر نسکام) اور جناب محمد خلیل۔

[redacted]

Date of Publication 24/04/2006

URDU DUNIYA Monthly, May 2006, Vol. 8, Issue: 5

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H R D , Government of India

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں پس نوشت آج پر کتاب کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

ڈیمائی سائز، صفحات 528، قیمت -/228 روپے

بہ تصحیح: نثار احمد فاروقی

غلام ہمدانی مصحفی کا وطن امروہہ تھا لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دلی اور لکھنو میں گزرا اور ان دونوں بڑے ادبی مراکز سے کسب فیض کر کے انھوں نے ایک نیا رنگ سخن ایجاد کیا جو ان کی پہچان بنا۔ مصحفی بڑے پرگو شاعر تھے جناب نثار احمد فاروقی نے مصحفی کے تمام کلام کی تدوین کی کلیات آٹھ جلدوں میں مرتب کر دیا ہے جس میں سے چار شائع ہو چکے ہیں

جلد اول۔ صفحات 495 قیمت -/220 جلد دوم۔ صفحات 369 قیمت -/154

جلد سوم۔ صفحات 320 قیمت -/181 جلد چہارم۔ صفحات 389 قیمت -/216

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

توبۃ النصوح اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جو پہلی بار 1877 میں شائع ہوا۔ اصلاح معاشرہ کے مقصد سے لکھے گئے اس ناول کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے اور یہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ناول کا یہ ایڈیشن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1963 میں شائع کردہ نسخے پر مبنی ہے

صفحات 175، قیمت -/75 روپے

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول میں انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ابن الوقت نوبل صاحب اور حجۃ الاسلام کے کرداروں کی مدد سے ناول نگار نے انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی حکاسی کی ہے جو اس عہد کی دو رنگی کا ... تھا۔ ناول کا متن اتر پردیش اردو اکادمی نے 1973 میں شائع کردہ متن پر مبنی ہے۔

صفحات 225، قیمت -/91 روپے

مصنف: الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی نہ صرف ایک باکمال شاعر اور نقاد تھے بلکہ انھوں نے سوانح نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا اور حیات سعدی یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ حیات جاوید میں حالی نے سرسید کی زندگی کے حالات افکار اور خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالی سرسید سے بہت قریب تھے اور سرسید کی ملک و قوم کی خدمت کی اس کے عینی شاہد۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات 907، قیمت:-/181 روپے

کلیات چودھری [illegible] جلدوں میں)

ترتیب وتدوین مسعود الحق

چودھری محمد علی ردولوی اپنے زمانے کے ایک روشن خیال اور شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کا تعلق بیسویں صدی کے ادیبوں کی اس نسل سے تھا جس میں مولانا محمد علی شوق سجاد حیدر یلدرم پریم چند مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری وغیرہ شامل تھے۔ اس کلیات میں ان کی تمام تحریریں جمع کر دی گئی ہیں

جلد اول صفحات 344 قیمت -/172 روپے

جلد دوم صفحات 455 قیمت -/172 روپے

جلد اول صفحات 450 قیمت -/172 روپے

1921 سے 1946 کے درمیان کانگریس کے 17 اہم جلسے ہوئے جن کی صدارت حکیم اجمل خاں سی آر داس محمد علی جوہر مولانا ابوالکلام آزاد مہاتما گاندھی سروجنی نائیڈو مختار احمد انصاری موتی لال نہرو جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں نے کی۔ اس کتاب میں آزادی سے قبل کانگریس کے جلسوں میں پیش کیے گئے تمام صدارتی خطبے جمع کر دیے گئے ہیں۔

صفحات 580، قیمت -/280 روپے

مصنف چارلس ڈکنس

مترجم فضل حسین

انگریزی کے عظیم ناول نگار چارلس ڈکنس کے ناول ڈیوڈ کاپر فیلڈ کو عالمی کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ شائع کرنے کا شرف کونسل کو حاصل ہے۔ مترجم نے بے حد سادہ اور عام فہم زبان میں اس ناول کو اردو کا لباس عطا کیا ہے۔

صفحات 516، قیمت:-/256 روپے

نوٹ - طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا

Printed and Published by Dr R K Bhat, Principal Publication Officer, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at S Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published from NCPUL, West Block-1, Wing-6 R K Puram, New Delhi-110066. Editor Dr R K Bhat, Tel 26103381, 26103938